33545

اوم

کیفِ سرمدی

ناشاد کانپوری

ایم-اے

حضرت ناشاد کانپوری کی غزلوں

اور دیگر

اصنافِ سخن کا مجموعہ

قیمت دو روپے
علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

دوارکا بھون۔ کاشی ڈیرہ لکھنؤ

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

فہرست

التماس

ناشاد صاحب میرے عزیز ہیں۔ میں نے ان سے بار ہا تقاضا کیا کہ وہ اپنا کلام شائع کرادیں لیکن ہر بار یہی جواب ملا کہ دیکھا جائے گا۔ ابھی جب وہ بسلسلہ تبادلہ میرے یہاں مقیم تھے تو ان کی بیاض دیکھنے لگا۔ اس میں جناب رشید صدیقی اور ضیا صاحب کے تحریر کردہ مقدمے بھی رکھے ہوئے ملے۔ ان کے دیکھنے کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اب کلام چھپنے کا وقت آگیا مگر جب ناشاد صاحب سے کہا تو وہی جواب ملا "دیکھا جائے گا"۔ میں سمجھ گیا کہ موصوف کا کلام اسی لیت و لعل میں ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا میں نے پرماتما کا نام لے کر اسے پریس میں دے دیا۔ اب یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ پروردگار اسے حسنِ قبول عطا فرمائے۔ آمین

نیاز مند

دیبی پرشاد نگم

محلہ کاشی ڈیرا۔ لکھنؤ

حالاتِ زندگی

(از جناب مدھر بہاری لال سریواستوا ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی فتحپور)

خاندانی حالات اپریل سنہ ۱۹۰۸ء میں نگم کایستھوں کے خاندان میں ولادت ہوئی۔ سریدھر پرشاد نام رکھا گیا۔ والد مرحوم کا نام منشی گوکرن پرشاد تھا اور منشی تکجا پرشاد دادا کا۔ آبائی وطن قنوج (ضلع فرخ آباد) تھا۔ گردشِ زمانہ کے ہاتھوں آپ کے بزرگ ترکِ سکونت کرکے کانپور میں کوئی دو سو سال ہوئے آبسے اور یہیں جائداد خرید لی۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں آپ کے پردادا کے والد منشی درگا پرشاد نے انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کرلی اور اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ آپ کے والد بزرگوار رائے صاحب منشی گوکرن پرشاد فوج میں کمیشنڈ افسر تھے۔ آپ کے بڑے بھائی رائے صاحب منشی منوہر پرشاد بھی فوج میں کمیشنڈ افسر تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی منشی لکشمی دھر پرشاد ابھی فوج میں ملازم ہیں۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی منشی گیادھر پرشاد بھی فوج میں ملازم تھے لیکن جوان مر گئے۔

تعلیم و تربیت ابتدا میں تعلیم و تربیت والد بزرگوار سے حاصل کی۔ اس کے بعد درجہ پنجم میں محبوب کالج (سکندرآباد دکن) میں داخل ہوئے اور وہیں سے

ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۲۷ء میں نظام کالج (حیدر آباد دکن) سے پاس کیا۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ دونوں امتحانات میں اردو میں امتیاز حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے وطن کانپور چلے آئے اور یہاں ڈی۔اے۔وی کالج اور ایس۔ڈی کالج میں تعلیم پاتے رہے اور یہیں سے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کا امتحان ۲۹ء و ۳۱ء میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ حالانکہ آپ نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی ہے لیکن طبیعت کو شروع سے ہی اردو سے لگاؤ رہا ہے۔ یہاں جناب جی۔این فرحت کانپوری سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ دورانِ قیام کانپور میں جناب منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کی فرمائش پر چند مضمون نثر میں لکھے جو رسالہ زمانہ میں بعنوان "دورِ حاضر کا انگریزی ناول" "دورِ حاضر کا انگریزی ڈرامہ" وغیرہ شائع ہوئے۔

۱۹۳۱ء میں جب آپ میرٹھ کالج میں ایل۔ایل۔بی کی تعلیم پا رہے تھے پروانۂ تقرری پہنچا۔ مجبوریاں تھیں۔ ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ اور نومبر ۱۹۳۱ء میں آپ نے تحصیل گھاٹم پور ضلع کانپور میں نائب تحصیلداری کا چارج لیا۔

بڑے غیور، شریف النفس، خاموش اور مرنجان مرنج ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نہایت خوددار اور صاف گو بھی۔ آخری دو وصف ایسے ہیں جن کی ملازمت میں گنجائش نہیں۔ ڈپٹی کلکٹر ہیں مگر ملازمت آپ کے لئے سوہان روح ہے۔ یہ غم روزگار رہا۔ رہ گیا غم عشق اس کے متعلق خود کہتے ہیں۔ ع۔ پوچھو نہ یوں ہی رہنے دو، کون کسی کا نام لے۔ جب آپ نے راز رکھا ہم بھی راز

رکھتے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں آپ نے منشی وشنو سروپ نجم ساکن پرتاب گڈھ کی دختر نیک اختر سے شادی کر لی۔ ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہے۔ اب تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ کئی بچے جاتے رہے۔ ان مسلسل جانکاہ واقعات نے دل میں درد پیدا کر دیا ہے۔ غمِ عشق۔ غمِ روزگار اور معصوم بچوں کی موتیں۔ کلام میں اثر ہے، درد ہے۔ جو بات نکلی ہے دل سے نکلی ہے۔ سوز و گداز کے بہترین شعر ملیں گے مگر میرا مقصود کلام پر تبصرہ نہیں۔ صرف حالاتِ زندگی پیش کرنا ہے۔ حیرت کی بات معلوم ہوگی کہ جس خاندان میں پشتہا پشت سے فوجی ملازمت چلی آئی ہو اس میں شاعر جنم لے۔ جن مردوں کے ہاتھوں میں رائفلیں رہی ہوں ان کے گھر میں ادب کا دلدادہ پیدا ہو لیکن کوئی حیرت نہیں معلوم ہوتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود فوجی ماحول کے علم و ادب کا چرچا بھی خاندان میں رہا۔ آپ کے دادا مرحوم فارسی کے شاعر تھے ایک دیوان فارسی میں چھوڑا جو آگ کی نذر ہو گیا۔ آپ کو طب میں ید طولےٰ حاصل تھا اور تمام عمر مفت علاج کرتے رہے۔ آپ نے طب کی کئی کتابیں لکھیں جو ابھی خاندان میں محفوظ ہیں۔ چھپنے کی نہ نوبت آئی نہ کوئی اُمید ہے۔

جو مختصر مجموعہ قارئین کے سامنے ہے اس کی چند غزلیں رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ تیج دہلی۔ ساقی۔ زمانہ۔ آجکل۔ تنویر۔ بیسویں صدی وغیرہ میں اسے زمانہ ہوا۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اب کہیں کلام نہیں بھیجتے۔ حضرت شیام موہن لال جگر بریلوی سے آپ مشورۂ سخن کرتے ہیں اور ان کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔

امّا بعد!

— از —

(پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو علیگڈھ یونیورسٹی)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یہ اس لئے کہ اس سے پہلے بہت سارے صفحات اس طرح کی باتیں لکھ لکھ کر پھاڑ چکا ہوں۔ مثلاً ادب کیا ہے؟ زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ وہ تعلق جائز ہے یا ناجائز؟ زندگی میں کیا خلل ہے؟ تنقید کیا ہے؟ مالیخولیا کا کیا درجہ ہے؟ روٹی کیسے ملے گی۔ انقلاب کب آئے گا؟ عورت کہاں جائے؟ میں کیا کروں اور ناشاد صاحب آدمی ہیں یا ڈپٹی کلکٹر؟

یہ اور اس طرح کی اور باتیں ردّی کی ٹوکری میں پہنچ گئیں۔ اور جب کوئی نیکی دریا میں ڈالنے سے نہیں رہ گئی تو دل ہلکا اور مزاج درست ہو گیا۔ ناشاد صاحب کا نہیں میرا۔ پھر ناشاد صاحب کے بارہ میں ان کے کلام سے فال نکالی تو یہ اشعار نکلے۔

نظر آتے ہیں وہ کچھ مہرباں سے
گلہ کس کو ہے اب عمرِ رواں سے

ازل سے آزماتے آرہے ہو
نظر آتے ہو پھر بھی بدگماں سے

دلِ ناشاد کا قصہ نہ چھیڑو
نکل جائے نہ کچھ اسکی زباں سے

امّا بعد!

عشق کا بھی کیا کھیل ہے پیارے
پیچھے بازی، پہلے مات

تم سمجھے تو میں ہی جھوٹا
کون بڑھائے تم سے بات

وہی ہوتی ہے بات کہنے کی
لب تک آکر جو بات رہ جائے

آخری شعر کے ساتھ حکیم آزاد انصاری مرحوم دہلوی کا بھی ایک شعر سنیئے۔

کتنے ہی بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

ناشاد صاحب کے یہ اشعار کیسے پسند نہ آئیں گے تاوقتیکہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہی نہ ہو۔ نرا شاعر اس طرح کے شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ ناشاد صاحب پیر فقیر قسم کے لوگ ہیں۔ قوالی سنتے ہیں۔ تعویذ لکھتے ہیں اور دعوت رُو نہیں کرتے۔ میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ انھوں نے عشق ورزی کی۔ پولیس ان کے پیچھے اور یہ اطباء کے پیچھے رہے اور مرتے مرتے بچے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ ناشاد صاحب کے تاثرات پڑھے لکھے شریف اور ذہین آدمی کے تاثرات ہیں جن کو وہ غزل کے اچھے اور مشکل سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ چھوٹی بحر میں اچھے شعر کہنا جتنا مشکل کام ہے اتنی ہی قابلِ تعریف بات ہے۔

شاعری ممکن ہے بہتوں کے بس کی ہو۔ غزل بڑی مشکل سے کسی کے قابو میں آتی ہے۔ بات کرنے کی تمیز ذرا کم ہی لوگوں کے حصّہ میں آتی ہے۔ صنفِ کلام کے اعتبار سے غزل کے بارہ میں جو چاہیئے کہہ دیجئے۔ مجھے اس سے نہ دلچسپی ہے نہ انکار۔ لیکن غزل صنفِ کلام ہی نہیں ہے۔ سلیقۂ کلام بھی ہے جو بہت سے شعراء تک کو نصیب نہیں۔ سچ بولنا سلیقہ سے بولنے سے آسان

ہے اور حسن آفرینی معنی آفرینی سے زیادہ مشکل ہے۔ سچ کے لئے بول دینا کافی ہے اور سچ بولنا کبھی کبھی بولنے والے کا اتنا کارنامہ نہیں ہوتا جتنا پولیس کی زدوکوب کا! سلیقہ کے لئے تو صرف سلیقہ درکار ہے۔

غزل ہمارے یہاں جن باتوں کی جس طرح نمائندگی کرتی ہے اور جن باتوں کی جس طرح طلب گار ہوتی ہے دوسری زبان کی شعروشاعری میں شاید ہی ملتی ہوں۔ غزل اُردو میں فارسی ہی سے آئی لیکن غزل کا معیار جس درجہ اردو میں مشکل اور ممتاز نظر آتا ہے وہ فارسی کے حصّہ میں نہیں آیا اور یہ اس لئے کہ اردو جن گوناگوں پیچیدہ سماجی۔ سیاسی اور تہذیبی عوامل کے کسر وانکسار سے گذری ہے فارسی کو اُن سے عہدہ برآ نہیں ہونا پڑا۔ شاعری اور ادب کی تشکیل و ترقی میں ان عوامل کی کارگذاری بڑی اہم ہے۔

غزل میں حسن و محبت کا ذکر ہوتا ہے اور حسن و محبت کے کاروبار "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔" جس شامت یا شادمانی سے دوچار ہوتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی لیاقت سے کبھی حماقت سے۔ کہیں شرافت سے کہیں شہدپن سے۔ لیکن ان مدارج سے گذر کر غزل اب وہاں پہنچ گئی ہے جہاں ممکن ہے آپ سب کو دھوکا دے سکتے ہوں غزل کو نہیں دے سکتے۔

غزل کہنا تو مشکل ہے ہی اس کا پرکھنا بھی کچھ کم مشکل نہیں۔ غزل کے معیار اور تنقید کے معیار میں جو توافق ہونا چاہیئے۔ آج کل کے بیشتر تنقید نگار یا تو ان کا لحاظ نہیں کرتے یا اُن سے آشنا نہیں ہیں یا پھر کسی عقیدہ کی خول سے باہر نکلنا در کنار، اس سے باہر جھانکنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے۔ بس کسی ایسی

امّا بعد!

تنقید کا قائل نہیں جس کے سانچے ڈھلے ڈھلائے پہلے سے موجود ہوں۔ غزل کے پرکھنے کے لئے غزل ہی سے تنقید کے اصول نکالنے پڑیں گے۔ بنے بنائے اصول باہر سے کمیشن پر منگانا اور کام نکل جانے پر کارخانہ کو واپس کر دینا تنقید نہیں نالائقی ہے۔ شاعری کا کوئی کارخانہ نہیں ہوتا۔ جہاں فرمائش کی چیزیں بالکل نپی تُلی ایک ہی طرح کی بے شمار تعداد میں نکلتی ہوں۔ شاعری مشینی عمل نہیں ہے۔ شخصی کردار ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے تنقید کے اصول اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا خود شاعر کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مستند طبیب وہ ہے جو نہ صرف مرض کو جانتا پہچانتا ہو (اتنے تو میرے اور ناشاد صاحب جیسے نیم حکیم بھی جانتے پہچانتے ہیں) بلکہ مریض سے پوری واقفیت اور ہمدردی رکھتا ہو۔ اتنی واقفیت جتنی کہ خود مرض کو مریض سے نہ ہو۔

اچھی غزل کے لئے لازم آتا ہے کہ غزل گو ان تہذیبی اور ادبی روایات سے بھی واقفیت اور ہمدردی رکھتا ہو جن کی ترجمانی غزل اور جن کی نمائندگی اردو کرتی ہے۔ غزل اردو شاعری کا معیار بھی ہے اور مزاج بھی۔ اور یہ سب کرا دھرا اردو کا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ مفاہمتوں کی تاریخ ہے۔ مفاہمت مفید ہوتی ہو یا نہیں، مجہول ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اردو ایک جاندار اور نمو پذیر مفاہمت کی یادگار ہے۔ اس نوعیت کی مفاہمت کا ہندوستان کتنا ہی متلاشی یا مستحق کیوں نہ رہا ہو، میسر اسے شاید کبھی نہ آئی۔ ہندوستان کو یہ امتیازہ و افتخار اردو نے دیا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر متحدہ اقوام نے کبھی کوئی ایسا تحقیقاتی کمیشن

اما بعد!

اٹھایا جو ہر ملک کے گذشتہ چند صدیوں کے منتخب کارناموں کی فہرست بنائے تو ہندوستان اپنے کارناموں میں اردو کو رکھے گا یا نہیں۔ متحدہ اقوام اور ہندوستان دونوں کے لئے یہ بڑا دلچسپ سوال ہوگا۔ اس لئے کہ ہندوستان کی تاریخی تسلسل میں اردو ایک نئے باب، ایک نئے امکان، اور ایک نئی بشارت کی نشاندہی کرتی ہے۔

ذکر کس کا تھا، بات کہاں جا پہنچی۔ اب ناشاد صاحب کے کچھ اور اشعار سنیئے۔

بدگمانی سی بدگمانی ہے — تم محبت کو مدعا سمجھے

وقت کی خوبیاں معاذاللہ — ہم بھی اپنے نظر نہیں آتے

ترکِ محبت کر دیں لیکن — اس پر بھی جب وہ یاد آئیں

ناشاد کے سوا بھی بہت جاں نثار ہیں — کیوں یاد آئی آپ کو اس خاکسار کی

محبت کو ہم نے محبت ہی سمجھا — نہ دشوار جانا نہ آسان جانا

کب تلک ہم یونہی جیا کرتے — مر نہ جاتے تو اور کیا کرتے

جی میں جو آئے تم وہی کرنا — بات سننے میں کیا برائی ہے

آپ اور ہم پہ ترکِ مشقِ جفا — جی نہ بہلا تو کیا کریں گے آپ

تذکرہ تھا گردشِ ایام کا — آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

رہ گئی دل کی دل میں بات — یونہی گزر گئی حیات

بات کچھ ایسی تھی نہیں — تم نے مگر سنی نہیں

ترے در سے اٹھ تو جاؤں تو ہی منصفی سے کہہ دے — ہو مری جبیں کے قابل کوئی اور آستانہ

امّا بعد!

کلام کی یہ گھلاوٹ، اندازِ بیان کی معصومیت اور محبت کی یہ سیدھی سچی باتیں مجھے بڑی دل آویز معلوم ہوئیں۔

زندگی کے حقائق بیان کرنا اپنی بیتی سُنانے سے اکثر آسان ہوتا ہو۔ فن اور شخصیت دونوں کو باہمدگر اس طرح پیوست رکھنا کہ یہ نہ معلوم ہو کہ کون کہاں شروع اور کون کہاں ختم ہوا بڑا مشکل اور بڑا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ ناشاد صاحب اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ان کے لب و لہجہ میں شائستہ تغزل کا ایسا رنگ ملتا ہے جو اِس دور میں مفقود ہے۔ شاعری میں شائستگی بڑی قیمتی چیز ہے۔ میں دنیا کے بد سے بدتر حالات و حوادث کو تسلیم کر لینے میں تامل نہ کروں گا لیکن اِس بنا پر شاعری میں بدذوقی اور بے تکے پن کو گوارا نہیں کر سکتا۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے مجھے حسرت بڑے عزیز ہیں۔ مجھے ان کی شائستہ شوخی اور شریفانہ بے تکلفی میں وہ دِل کشی ملتی ہے جو دوسرے شعراء کی فلسفہ طرازی میں نہیں ملتی۔ ناشاد صاحب کا رنگ حسرت کا رنگ نہیں ہے لیکن بعض اعتبار سے وہ حسرت سے قریب ہیں۔ ناشاد کا لہجہ حزیں ہے اور یہ حزن بیمار کا نہیں صحت مند کا حزن ہے۔ ان کے یہاں عشق آزمائش ہو کر پہنچا ہے، مرض بن کر نہیں۔ حسرت کا عجیب کمال یہ ہے کہ وہ کسی بات کے کہہ گزرنے میں جھجکتے نہیں اور اکثر ہم کو اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ یہاں حسرت کی طرف سے ہم آنکھیں نیچی کئے بغیر نہ رہیں گے لیکن ذرا ہی معلوم ہوگا کہ ایسا بالکل نہیں ہوا بلکہ بات کبھی بڑے مزے کی تھی اور کبھی بڑے مزے سے کہی گئی۔ یہ بات ناشاد صاحب کے یہاں نہیں ہے۔ ناشاد

اما بعد!

صاحب کہنے کے لئے باتوں کا انتخاب پہلے سے کر لیتے ہیں اور ایسی باتوں کو ترک کر دیتے ہیں جن کو شاید اپنے کلام میں وہ نباہ نہیں سکتے۔

حسرت۔ اصغر۔ فانی اور جگر کے بعد نئے دور کے غزل گویوں میں ناشاد صاحب کا لب ولہجہ کم شعراء کے یہاں ملے گا۔ سوا انھیں کے قبیلہ کے ایک اور ڈپٹی صاحب حبیب احمد صدیقی کے یہاں۔ ناشاد صاحب کے یہ اشعار دیکھئے۔

بھا گئیں کیوں دہر کی رنگینیاں — ہو گیا ذوقِ نظر برباد کیا

برا ہو بیخودیٔ عشق کا خبر نہ ہوئی — ہزار بار گلے سے لگا لیا تو نے

دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو — غم کے ماروں کی زندگی کیا ہے

اب کہاں جائیں، کون پوچھے گا — تیرے دیوانے تیرے سودائی

تذکرہ تھا گردشِ ایام کا — آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

لکھنؤ کے رنگ کا بھی ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے موقعہ کا بڑے مزے کا شعر ہے۔

مول لگا ہے دِل کا کب، لے لو تمہیں ہے گر پسند
یاد کرو گے تم بھی کیا، کون اب اس کے دام لے

ناشاد صاحب نے پرانی تہذیب و شائستگی ہی سے نہیں، پرانی شاعری سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ زیادہ تر وہ داغ اور امیر کی زبان سے متاثر ہیں لیکن داغ اور امیر کی شاعری کی بعض لغزشوں سے بچے ہیں۔ اچھے غزل گو کی مانند ناشاد صاحب نے شاعری اور عاشقی دونوں

اما بعد!

کے حدود کا احترام کیا ہے۔ عیاشی اور اوباشی کا اشتہار نہیں دیا ہے۔
آج کل کی جدید شاعری سے وہ اور اُن کی شاعری دونوں بے تعلق ہیں لیکن میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ خسارے میں نہیں ہیں۔ میں تو شاعری میں عیاشی کا بھی دلدادہ ہوں لیکن شاعری میں بدکاری اور اوباشی یا "بھیجو۔ پکڑیو۔ ماریو۔ جانے نہ پائے" وغیرہ میرے گلے سے نہیں اُترتے۔

تقریب

:: از ::

پروفیسر ضیاء احمد ضیاؔ بدایونی
علی گڑھ یونیورسٹی

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق و ایں عجب
از ہر کسے کہ می شنوم نا مکرر است

شعر و شاعری کے بارے میں مدّت سے بحث چلی آتی ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ ارسطو[1] جس نے سب سے پہلے اس مبحث پر قلم اٹھایا ہے اس کو زندگی کی مصوّری یا نقّالی کہتا ہے۔ عربی ادباء کے نزدیک شعر کلام موزوں ہے جس کو متکلّم نے بالارادہ موزوں کیا ہو۔

ایران والے تخییل کو شاعری قرار دیتے ہیں۔ اہل منطق کا بیان ہے کہ الشعر ما تنبسط بہ النفس او تنقبض۔ یعنی جس چیز سے نفس کو انبساط یا انقباض پیدا ہو وہ شعر ہے۔ مِل کا دعویٰ ہے کہ جو چیز جذبات کو برانگیختہ کر سکتی ہو وہ شاعری ہے۔ میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ شعر تنقید حیات ہے۔

---

[1] شعرالعجم حصہ اول و چہارم۔

غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔ مجھے تو علامہ شبلیؔ کی تعریف پسند آئی کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ اور میں جب کسی شعر کو دیکھتا ہوں تو اِسی نظریے کے تحت دیکھتا ہوں کہ اُس میں احساسات و جذبات کی ترجمانی کس حد تک کامیاب ہے اور اسکے لئے پیرایۂ بیان کیا اور کیسا اختیار کیا گیا ہے۔

احساسات و جذبات میں عشق و محبت کو جو درجہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شبلیؔ نے سچ کہا ہے کہ عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اس لئے جہاں انسان ہے وہاں عشق بھی ہے۔ فارسی اور اردو والوں نے عشق کے بیان کے لئے جس صنف کو مخصوص کر لیا ہے وہ غزل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ صرف غزل ہی میں عشقیہ مضامین بیان کئے جاتے ہوں۔ یا غزل میں ان مضامین کے سوا دوسرے مضامین مطلق نہ آتے ہوں پھر بھی غزل کا امتیازی وصف عشق ہی کی ترجمانی رہا ہے۔

دورِ حاضر میں غزل جس قدر ہدفِ اعتراضات رہی ہے کوئی اور صنف نہیں رہی۔ اس[1] مسئلے پر موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ شکر ہے کچھ عرصے سے مخالفت کے بادل چھٹتے جا رہے ہیں اور معترضین بھی غزل کے محاسن کا دبی زبان سے اعتراف کرنے لگے ہیں۔ خود نئے ادب کے حامیوں میں متعدد

---

[1] مقالۂ راقم (غزل۔ ایک وحشیانہ صنف؟) رسالہ احسن رامپور بابتہ فروری مارچ ۱۹۵۲ء

تقریب

افراد غزل کہتے اور خوب کہتے ہیں۔ غزل کی بعض حدود و قیود سے انکار نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جن کو قدرت نے شعر کا صحیح ذوق دیا ہے انھوں نے انھیں حدود و قیود میں رہ کر شاعری کے حیرت انگیز نمونے پیش کئے ہیں۔ میر درد۔ آتش۔ غالب۔ حالی۔ اقبال۔ حسرت۔ اصغر۔ فانی۔ یاس۔ جگر کی غزلیات کو ہم دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اور اگر ان کا کلام صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے تو نہ صرف اردو ادب بلکہ جہاں تک کلچر کی ترقی کا سوال ہے دنیا خسارے میں رہے گی۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ زیرِ نظر مجموعے کے مصنف مسٹر نگم متخلص بہ ناشاد غزل کی وادی میں مذکور الصدر اساتذہ کے ہم سفر ہیں البتہ جیسا کہ آیندہ مثالوں سے واضح ہوگا انھوں نے ان کی رہنمائی میں چل کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے جس میں وہ یقیناً کامیاب ہیں۔

نگم صاحب کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا پیشۂ آبا کئی پشت سے سپہ گری کا اعزاز اور فوجی اہلکار رہا ہے۔ اِس لئے شاعری اُن کے لئے ذریعۂ عزت نہیں۔ تاہم اُن کا گھر ادبی چرچوں سے بیگانہ نہیں رہا۔ خود وہ انگریزی ادب میں ایم۔ اے ہیں اور اُردو سے کافی شغف رکھتے ہیں۔ نگم صاحب کو عرصے سے اردو شاعری سے لگاؤ ہے اور وہ جناب جگر بریلوی سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔

وہ ایک شریف طبع اور غیور مزاج انسان ہیں۔ اِسی اندازِ طبیعت کی جھلک اُن کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ایک چھچھوری

اور گھٹیا طبیعت کا آدمی ممکن ہے کہ اچھا نظم نگار تو ہو جائے مگر اچھا غزل گو نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ اور جیسا کہ اُن کے سوانح نگار کا بیان ہے ان کو غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں سے سابقہ رہا ہے۔

اُن کی غزل تمام تر احساسات و جذباتِ محبت کی ترجمانی ہے۔ یہ ترجمانی کس قدر کامیاب ہے۔ اور اُن کا پیرائیہ بیان کتنا دل کش ہے یہ آگے چل کر عرض کیا جائے گا۔ اتنا تو ہر شخص ان کے دیوان کے مطالعے کے بعد کہہ سکتا ہے کہ ان کی شاعری روایتی شاعری نہیں ہے۔ روایت کا میں مطلق مخالف نہیں ہوں۔ ادب کی میراث جو قدما سے پہنچی ہے اس کو سرے سے نظر انداز کر دینا اور اُس سے فائدہ نہ اُٹھانا بڑی محرومی ہوگی۔ البتہ جذبات و خیالات میں کسی کی تقلید کرنا[1] ادب میں جمود کی حمایت کرنا ہے۔ شاعرِ مشرق[2] نے کیا خوب کہا ہے کہ ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اور سلیم المذاق انسان وہی ہے جو آسمان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی زمین سے رشتہ قطع نہ کرے۔ ان کے خیالات میں گہرائی اور جذبات میں گیرائی ہے۔ اور یہ دو چیزیں کسی شاعر کو میسر ہوں تو پھر اور کیا چاہیئے۔ مثلاً موت و حیات کے بارے

---

[1] لا یجوز التقلید فی الاعتقاد (یعنی عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے اعمال میں دوسری بات ہے) [2] مکاتیب اقبال۔

میں اکثر شعراء نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن فرماتے ہیں۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

چکبست کا مشہور شعر ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

نگم صاحب کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو۔

موت کیا ہے، نغمۂ خاموش ہے
زیست کیا ہے، دکھ بھری آواز ہے

نغمۂ خاموش اور دُکھ بھری آواز کا ایجاز و بلاغت و شعریت تو اپنی جگہ ہے، واقعیت ہے مسلّم ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

موت کیا ہے آپ ہی کھُل جائے گا
پہلے سمجھو زندگی کیا راز ہے

شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ سچ ہے۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است۔ خوبی یہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف عموماً ہمارا خیال نہیں جاتا مگر شعر پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ارے یہ تو ایک کھلی ہوئی صداقت تھی۔

مرزا غالب عالم کو "حلقۂ دامِ خیال" کہتے ہیں۔ نگم صاحب کے یہاں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔

عکسِ رنگیں ہے نگاہِ شوق کا — اور شرح عالم ایجاد کیا

اِس سے ملتا ہوا دوسرا شعر لیجئے۔

دنیا ہے آئینہ خانہ — ہم جیسے تھے ویسا دیکھا

رومی فرماتے ہیں۔

ترک و ہندو در من آں بیند کہ اوست

ایک جگہ کہتے ہیں۔

خود اچھے تو دنیا اچھی — کون بھلا ہے کون بُرا ہے

عشق و محبت ان کا دل پسند موضوع ہے۔ اور اُس کے لئے نئے نئے اسالیب اُن کو ہاتھ آگئے ہیں۔ چند مثالوں سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو گی۔

وہ محبت محبت ہی کے لئے کرتے ہیں۔ محبت کے ساتھ کوئی دوسرا اعتبار (CONSIDERATION) دراصل اس کی اہانت ہے۔

زہے بد گمانی، خوشا بد گمانی — محبت کو بھی تم نے ارمان جانا

محبت کو ہم نے محبت ہی سمجھا — نہ دشوار جانا نہ آسان جانا

یہ وہ مقام ہے جہاں ہر ہر لمحہ عبادت متصور ہوتا ہے۔

ہر ہر نفس پیامِ محبت ہے ہم نشیں — یہ زندگی نہیں ہے عبادت ہے ہم نشیں

اور زندگی اور زندگی کے مصائب بھی کسی کی امانت نظر آتے ہیں۔

دردِ جگر کسی کی عنایت ہے ہم نشیں — ہستی بھی ایک بارِ امانت ہے ہم نشیں

اِس جذبۂ بے نام کو بعض اوقات محبت کہتے ہوئے بھی تامل ہوتا ہے۔

تقریب

دل کو کچھ اُن سے اور ہی نسبت ہے ہم نشیں
کیونکر کہوں کہ ربطِ محبت ہے ہم نشیں

اس کا لازمہ وہ بیخودی ہے جو اکثر التفاتِ یار کا بہانہ بن جاتی ہے۔

بُرا ہو بیخودیِ عشق کا خبر نہ ہوئی ہزار بار گلے سے لگا لیا تو نے

اس کا ترک کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

ترکِ محبت کر دیں لیکن اس پر بھی جب وہ یاد آئیں

اس منزل پر پہنچ کر محب و محبوب کا تفرقہ بھی اُٹھ جاتا ہے۔

عشق ہے حسن سے جُدا کوئی اب بتائے کسی کو کیا کوئی

عشق و محبت کی بدولت ان کو غم بھی پیارا ہے۔ یا تو اِس لئے کہ شعرا کی اصطلاح میں "عشق" غم ہی کہلاتا ہے۔ گو صوری طور پر سہی۔ یا اِس وجہ سے کہ غم و الم لوازمِ عشق ہیں۔ اور چونکہ کسی کا عطیہ ہیں۔ اس لئے کیوں عزیز نہ ہوں۔

چند شعر سنیئے۔

یہ کتنا مقصود ہے کہ غم کے بغیر زندگی دو بھر ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دِل کو غم سے حذر نہ ہو جائے زندگی دردِ سر نہ ہو جائے

یہ غم جسے مل جائے اُسے پھر اور کیا چاہیئے۔

جس پہ لاکھوں مسرتیں صدقے ایک ایسی بھی غم کی رات ہوئی

ہائے عرفیؔ کیا خوب کہہ گیا ہے۔

از لذّتِ دنیا الم آشوب نہ گردم زیں باد پریشاں نکنم زلفِ الم را

تقریب

یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں نگم صاحب کے یہاں غم کا عام اور متداول تصور بھی ہے مگر بیشتر ان کا غم ایک کیفِ سرمدی ہے جو صرف خوش نصیبوں کو ملتا ہے۔

غم کے سب راز داں نہیں ہوتے | مہر ہر ایک پر نہیں ہوتی

مشہور ہے کہ کسی نے مجنوں سے کہہ دیا کہ آج لیلیٰ باڑا بانٹ رہی ہے۔ یہ حضرت بھی اپنا کشکول لے کر پہنچے۔ اس نے وہی کشکول ان کے سر پر دے مارا جس سے تمام سر لہو لہان ہو گیا۔ آپ وہاں سے ہنستے قہقہے لگاتے چلے آرہے ہیں۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ اگر مجھے بھی وہی ملتا جو اوروں کو ملا تو مجھ میں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا۔ صوفیہ کا قول ہے کہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ اسی عشقِ مجاز کی بدولت نگم صاحب کہیں کہیں روحانیت کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔

سن رہا ہوں نغمہ ہائے سرمدی | رقصِ پیہم کر رہی ہے زندگی
جس پہ نثار دیر و حرم کی بلندیاں | اتنا وگی عشق وہ رفعت ہے ہم نشیں
یوں تو دیر و حرم بھی ہیں لیکن | آپ کے نقشِ پا سے نسبت کیا
یہ کب تک پردہ ہائے ماہ و انجم | اٹھا دے ان حجابوں کو اٹھا دے
پردے ڈالے ہیں ماہ و انجم کے | خود نمائی سی خود نمائی ہے

کسی استاد کا شعر یاد آیا۔

بے حجابی یہ کہ ہر ذرے سے جلوہ آشکار
اس پہ پردہ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

نگم صاحب کے یہاں اس رنگ کے شعر ملاحظہ کیجئے۔

بے خود و ہشیار جو چاہیں کریں ۔۔۔ چشمِ ساقی کے اشاراتِ نہاں
جب عیاں اپنی حقیقت ہو گئی ۔۔۔ ذرّے ذرّے سے محبت ہو گئی

اسی سلسلے میں کبھی کبھی جبر و اختیار کا مسئلہ بھی ان کا موضوعِ فکر بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔

اب دیجیئے سزا کہ جزا اختیار ہے ۔۔۔ مجبوریاں تھیں وہ کہ خطا بار بار کی
انساں سا مجبور نہ دیکھا ۔۔۔ قید نہیں، آزاد نہیں ہے

اُردو شعرا میں اِس مبحث پر فانی بدایونی سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ ان کے دو شعر بھی سُن لیجیئے۔

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا، اب یہ بتا، ہم کیا کریں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ۔۔۔ ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

غرض نجم صاحب کا مذاقِ شعر اتنا بلند اور لہجہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ زبان کی شُستگی اور شائستگی بندشوں کی چستی اور صفائی حیرت انگیز ہے۔ خصوصًا چھوٹی بحروں کا ترنّم اور دلکشی ان کا حِصّہ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ نگاہ خوردہ بیں کو تلاش سے بھی ان کے یہاں فنّی اسقام نظر نہ آئے۔ یوں تو غزلوں کی غزلیں سلاست و لطافتِ زبان کا عمدہ نمونہ ہیں خصوصًا جن کے مطالع حسبِ ذیل ہیں۔

پریم کہانی کون سُنائے ۔۔۔ درد کی دولت کون لٹائے
بلبل محبت کی جب بولی ۔۔۔ پھول ہنسے اور شبنم رو دی

جھوٹی دنیا جھوٹی مایا
کون ہے اپنا، کون پرایا

وہ کسی سے کرتے ہیں بات
اُن کا دن ہے اُن کی رات

تم پوچھ کے حال کیا کرو گے
میرے دکھ کی دوا کرو گے؟

پھر بھی جی چاہتا ہے کہ ان کی بعض دوسری غزلوں سے زبان کے متفرق اشعار پیش کر دیئے جائیں۔

جی میں جو آئے تم وہی کرنا
بات سننے میں کیا برائی ہے

چارہ سازوں کا کچھ قصور نہیں
درد ہی لا دوا ہے، کیا کیجئے

چاند تارے بھی اب تو سونے لگے
اے غمِ ہجر، کتنی رات ہوئی

دل کا ایمان اور ہی کچھ ہے
عاشقی ذات پات کیا جانے

سچ بتا میرے بھولنے والے
کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں

عشق میں اس کا کیا غم پیارے
جیتے جیتے، ہارے ہارے

تذکرہ تھا گردشِ ایام کا
آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

کہیں کہیں ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ بھی آ گئے ہیں۔ مثلاً

امرت رس ہیں ان کی باتیں
مدرا کا مدھ ان کی جوانی

مگر ان میں وہ بناوٹی اور کٹھن انداز نہیں جو آج کل ہر جگہ ٹھونسا جا رہا ہے۔

نگم صاحب نے کچھ مسلسل غزلیں نظمیں اور گیت بھی لکھے ہیں جن میں بیشتر لطیف خیالات۔ شیریں انداز اور ہلکے پھلکے بول ہیں۔ تاہم ان کی مرغوب صنف غزل ہی ہے جس کے مطالعے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ غزل نہ کہتے تو اپنی طبع خداداد پر، اور اگر کلام شائع نہ کرتے تو اہلِ ذوق پر ظلم کرتے۔

دُعائے جگر

—— :: از :: ——

——:: (عالی جناب جگرؔ صاحب بریلوی) :: ——

ناشادؔ صاحب سے میرے تعلقات کم و بیش بیس سال سے قایم ہیں غالباً ۱۹۴۶ء میں آپ نے اپنی چند غزلیں میرے پاس بھیجیں۔ ارشاد تھا کہ انھیں دیکھ لیجئے۔ میں بڑے پس و پیش میں پڑ گیا۔ مجھے استادی شاگردی کا رشتہ قایم کرنے سے ہمیشہ پرہیز رہا۔ یوں تو جس کسی نے خلوص سے مشورہ چاہا میں نے دریغ نہ کیا اور ایسے بہت موقع آئے لیکن مستقل طور پر اصلاح کا سلسلہ جاری کرنے سے بچتا ہی رہا۔

ناشادؔ صاحب سے ایسے تعلقات تھے کہ تعمیل ارشاد پر مجبور ہو گیا۔

میری تمنّا تھی کہ آپ کے کلام پر خود کچھ لکھتا صرف اس وقت کا منتظر تھا۔ کہ کلام اتنا ہو جائے کہ اسے مجموعہ کہہ سکیں۔ جب یہ وقت آیا تو میں اس قابل نہیں کہ کوئی دماغی مشقّت برداشت کر سکوں کوئی دو سال سے اعصابی امراض میں مبتلا ہوں، غور و فکر کی قوّت بالکل باقی نہیں۔ اب جو دو اہل ذوق و ادب نے آپ کے کلام پر مقدمے لکھ دیئے ہیں تو گویا میری تمنّا ان کے قلم سے نکل گئی۔ ان کے متعلق ایک بات کہنا ہے۔ صدّیقی صاحب نے ناشادؔ صاحب

کو خواہ مخواہ حسرت موہانی سے ٹکرا دیا۔ اِس سے موازنہ تو کہا نہیں جا سکتا۔ موازنے کے شرائط اور ہیں۔ یہ تقابل بالکل بے ضرورت اور بے موقع ہی نہیں رہا بلکہ اس سے تنقید میں تنقیص کی صورت پیدا ہو گئی۔ کوئی صاحب فن کسی نقاد سے اپنے فن کے متعلق رائے چاہے وہ نقاد سب کچھ کہنے کے بعد کسی اپنے محبوب ماہر فن کا دفعتہً نام لے کر کہہ پڑے کہ اسے تم نہیں پہنچتے تو اسے کیا کہیں گے۔

ضیا صاحب کا تبصرہ بہت سلجھا ہوا، مربوط اور باقاعدہ ہے۔ اس میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ناشاد صاحب نے بڑی سلامت، صفائی، شائستگی، دل کشی اور ندرت سے غزل کہی ہے۔ بڑا پیارا اسلوب ہے اور اپنی جگہ نہایت ممتاز۔ جو پاکیزگی آپ کی غزل میں ہے اردو تغزل میں ذرا اور سے سمجھنا چاہیئے۔ آپ کا مجموعہ عروس شعر کے لئے ایک نفیس زیور ہی نہیں اُس کی سیرت کو بھی سنوارتا ہے۔ پروردگار حسنِ قبول بخشے۔ آمین۔

اب آپ ناشاد صاحب کے چند اشعار سنیئے۔

(۱) یہ سب ہیں دل کے بہلانے کی باتیں
قفس سے اور اُمید رہائی!

(۲) دل کو غم سے حذر نہ ہو جائے — زندگی دردِ سر نہ ہو جائے

(۳) ناامیدی بھی ساتھ چھوڑ نہ دے — دل بھی مفلس کا گھر نہ ہو جائے

(۴) کٹ ہی جائیگی کسی کی یاد میں — زندگی کیا چار دن کی زندگی

دُعائے جگر

قیدِ ہستی سے چھوٹ تو جاتے (۵) ہر ستم آسرا ہے کیا کہیئے

یہ دِل میں کون چُھپتا جا رہا ہے (۶) ستارے جھانکتے ہیں آسماں سے

(۷) کچھ ہنس کے کٹی، کچھ رو کے کٹی، کچھ ایسے کٹی، کچھ ویسے کٹی

رودادِ محبت کیا کہیئے، رودادِ جوانی کیا کہیئے

یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے (۸) جی رہا ہوں جیا نہیں جاتا

خود تماشہ ہے خود تماشائی (۹) حُسن اپنا ہے آپ شیدائی

اِک تمنّا تھی ان سے مِلنے کی (۱۰) عمر گزری مگر نہ بر آئی

اب کہاں جائیں، کون پُوچھے گا (۱۱) تیرے دیوانے، تیرے سودائی

دِل نذرِ جمالِ یار کر کے (۱۲) احساس ہوا ہے زندگی کا

سب موت جسے سمجھ رہے ہیں (۱۳) صدقہ ہے بہارِ زندگی کا

یوں تو دیر و حرم بھی ہیں لیکن (۱۴) آپ کے نقشِ پا سے نسبت کیا

کاٹتا ہو جو عمر رو رو کے (۱۵) اس کو کیا دن ہوا کہ رات ہوئی

بیخود و ہشیار جو چاہیں کریں (۱۶) چشمِ ساقی کے اشاراتِ نہاں

چُپ ہیں کچھ سوچ کر اسیرِ قفس (۱۷) یاد کیا بال و پَر نہیں آتے

جب بات بات پر وہ رہ رہ کے یاد آئیں (۱۸) ناصح تو ہی بتا دے کیونکر انھیں بھلائیں

دِل جل بجھا کبھی کا اب کیا نشاں بتائیں (۱۹) اِک راکھ رہ گئی تھی، وہ لے اُڑیں ہوائیں

(۲۰) اب کیا کریں ہم اس کو، جب دِل کہا نہ مانے

ورنہ یقین مانو، ہوتیں نہ یہ خطائیں

ناشاد کیا کہا یہ، کِس نے کہا یہ تم سے (۲۱) وہ یاد کر رہے ہیں، کیا خوب، مان جائیں

غمِ دِل کا علاج کیا کرتے (۲۲) زخم ہوتا تو سی لیا کرتے

کب تلک ہم یوں ہی جیا کرتے (۲۳) مر نہ جاتے تو اور کیا کرتے

ہو گئے ہیں ہم اپنے شیدائی (۲۴) دِل کو کیا محو ماسوا کرتے

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ (۲۵) عشق کی پھر سے ابتدا کرتے

کون لگائے دِل پھر ان سے (۲۶) اُجڑی بستی کون بسائے

آپ کی باتیں سچ پر کوئی (۲۷) اوس سے کیونکر پیاس بجھائے

کس کی یاد نے چٹکی لے لی (۲۸) آنکھ میں آنسو کیوں بھر آئے

(۲۹) موج زن ہے اس طرح دِل میں اُمید

جیسے پھولوں سے گزرتی ہو صبا

آرہا ہے اس طرح ان کا خیال (۳۰) جیسے اک جھونکا نسیم صبح کا

چمن کی سیر کرنے کون آیا (۳۱) کھِل اُٹھے پھول سبزہ لہلہایا

محبت نے سبق ایسا پڑھایا (۳۲) برابر ہے ہمیں اپنا پرایا

(۳۳) فرشتے گوش بر آواز ہیں آج

مرے لب پہ یہ کس کا نام آیا

بیل محبت کی جب بوئی (۳۴) پھول ہنسے اور شبنم روئی

کوئی دُکھ کا مارا رویا (۳۵) دنیا چادر تان کے سوئی

اربابِ وفا کو دیکھتے ہیں (۳۶) دنیا کی ہوا کو دیکھتے ہیں

عالم کو ہوا بتا رہی ہے (۳۷) دنیا کی ہوا کو دیکھتے ہیں

تلخیٔ زیست ہاں گوارا ہے (۳۸) کس کو دم مارنے کا یارا ہے

(۲) پیرِ مغاں کا نام لے، ہاتھ میں اپنے جام لے
بادۂ ناب پی بھی جا، عقل سے کچھ تو کام لے

(۳) کس نے یہ دردِ دل دیا، کس نے یہ غم عطا کیا
پوچھ نہ یونہی رہنے دے، کون کسی کا نام لے

(۴) مول لگا ہے دل کا کب، لے لو تمہیں ہے گر پسند
یاد کروگے تم بھی کیا، کون اب اس کے دام لے

دِل کی بات نہ کہنا، پیارے (۴۲) منھ سے نکلی ہوئی پرائی
کیسی دوزخ، کیسی جنّت (۴۳) سب باتیں ہیں، سُنی سُنائی
دِل بہلا لے، دھوکا کھا لے (۴۴) جاں سے اور امیدِ رہائی!
وہ کیا جانے درد پرایا (۴۵) جس نے دِل پر چوٹ نہ کھائی
مردہ دِل میں کیوں آس آئے (۴۶) کیا دیں سوکھے دھان کو پانی
دیکھا خونِ تمنّا دیکھا (۴۷) دیکھا رنگِ دنیا دیکھا
دنیا ہے آئینہ خانہ (۴۸) ہم جیسے تھے ویسا دیکھا
کچھ تبسّم کرکے وہ کیا کہہ گئے (۴۹) چاند تارے سر جھکا کر رہ گئے
تذکرہ تھا گردشِ ایّام کا (۵۰) آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے
رازِ سربستہ و نہاں ہیں ہم (۵۱) اپنے اور ان کے درمیاں ہیں ہم
نہ ہم سے ہنستے بنتا ہے نہ روتے (۵۲) یہ کوئی زندگی ہے زندگی ہیں
دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو (۵۳) غم کے ماروں کی زندگی کیا ہے
جانے کیا آج ہونے والا ہے (۵۴) دِل دھڑکتا ہے کیوں خدا جانے

دعائے جگر

سب نے چھوڑا کیا کنارا (۵۵) غم بھی کب تک دے گا سہارا

(۵۶) نہ ہے بدگمانی، خوشا بدگمانی محبت کو بھی تم نے ارمان جانا

(۵۷) بُرا ہو بے خودیٔ عشق کا جسے نہ ہوئی

ہزار بار گلے سے لگا لیا تو نے

(۵۸) آپ اور ہم پہ ترکِ مشقِ جفا

جی نہ بہلا تو کیا کریں گے آپ

(۵۹) اور ابھی ارمانِ وفا ہے؟

چُپ بیٹھا کیا سوچ رہا ہے

جو ہونا ہے ہو گا ہو گا (۶۰) دِل جانے کیوں ڈوب رہا ہے

جوشِ الم کا پوچھ نہ عالم (۶۱) دریا موجیں مار رہا ہے

(۶۲) مر ہی گئے ہستی کے مارے

کب تک جیتے غم کے سہارے

(۶۳) اُن سے دِل ناشاد لگا کے

پھرتے ہیں اب مارے مارے

(۶۴) مے سے اب تسکین نہ ہو گی

اس میں تھوڑا زہر ملائیں

آپ کی یاد عمر بھر آئی (۶۵) ہم بھلایا کئے، مگر آئی

(۶۶) دِل کی ہر چوٹ پھر اُبھر آئی

دیکھ کر ان کو آنکھ بھر آئی

(۶۷) کر تو لیں ہم شراب سے توبہ
پھر طبیعت جو راہ پر آئی

کیا جینا افتاد نہیں ہے (۶۸) داد نہیں ، فریاد نہیں ہے

(۶۹) دِل کا ہر زخم ہو گیا تازہ
درِ زنداں کھلا ہوا آئی

(۷۰) اس سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے
جو نہ ہنس پائے اور نہ رو پائے

(۷۱) ہوتے رہے آپ کے اشارے
سب جیتے رہے زندگی کے مارے

(۷۲) کچھ سوچ کے رو رہا تھا کوئی
جب ڈوب رہے تھے چاند تارے

(۷۳) آغازِ محبت دیکھ لیا ، انجامِ محبت دیکھ لیا
پھر عشق کو رسوا کون کرے ، تجدیدِ تمنا کون کرے

(۷۴) شکوہ بھی انھیں کا کرتے ہیں ، ہے لطف انھیں پر مرتے ہیں
یہ راز ہے سرتاسر ہمدم ، اس راز کو افشا کون کرے

(۷۵) نگاہِ فتنہ زا نے کیسے کیسے رنگ بدلے ہیں
کہو کیا ہو اگر یونہیں کہیں رسمِ وفا بدلے

(۷۶) رہ گئی دِل کی دِل میں بات ، یونہی گزر گئی حیات
بات کچھ ایسی تھی نہیں ، تم نے مگر سنی نہیں

(۷۷) یونہیں ربط ان سے مجھ سے ہر نفس ہے
ہو جیسے غنچہ و گل کا صبا سے

(۷۸) بھلائے اس کو مدت ہو گئی ہے
مگر ہر بات پر وہ یاد آیا

(۷۹) فضا بدلے، ہوا بدلے، مکاں بدلے، زماں بدلے
ذرا تم مسکرا تو دو کہ رنگِ آسماں بدلے

(۸۰) نہ پھولوں میں وہ بُو باقی نہ تاروں میں ضیا باقی
نگاہِ ناز کیا بدلی، زمین و آسماں بدلے

غزلیات

قیات

اوم

فضائے ہر دو عالم جگمگائی　　یہ کس نے پھر نقابِ رُخ اٹھائی
کھِلے غُنچے، ستارے مسکرائے　　جھلک کس نے پسِ پردہ دکھائی

بڑھائی ان سے جب رسمِ محبت
حیاتِ چند روزہ مسکرائی

یہ سب ہیں دل کے بہلانے کی باتیں
قفس سے اور امیدِ رہائی!

انھیں بھی اب حجاب آنے لگا ہے　　محبت رنگ لائی رنگ لائی

نہ کچھ اب تک ہوا ہے اور نہ ہوگا
بہت ناشادِ قسمت آزمائی

سنہ ۱۹۴۰ء

(۲)

دل سے پیدا وہ نوائے راز ہے
ایک عالم گوش بر آواز ہے

گُل کِھلائے چاہے کچھ وہم و قیاس
کون ورنہ آشنائے راز ہے

دِل کی دھڑکن کہہ رہی ہے صاف صاف
کوئی سرگرم خرامِ ناز ہے

موت کیا ہے، نغمۂ خاموش ہے
زیست کیا ہے، دُکھ بھری آواز ہے

موت کیا ہے آپ ہی کُھل جائے گا
پہلے سمجھو زندگی کیا راز ہے

کچھ سمجھتے ہی نہیں اہلِ حرم
ورنہ جو سجدہ ہے کعبہ ساز ہے

فکرِ ناشاد آج ہے سحر آفریں
فیضِ فرحت کا یہی اعجاز ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

(۳)

دل کو غم سے حذر نہ ہو جائے
زندگی دردِ سر نہ ہو جائے

غمِ ہجرت اثر نہ ہو جائے
بے خبر با خبر نہ ہو جائے

جا ہی پہنچیں ہم اس کے کوچے میں
عقل اگر راہبر نہ ہو جائے

نا امیدی بھی ساتھ چھوڑ نہ دے
دل بھی مفلس کا گھر نہ ہو جائے

دل کے داغوں کو تازہ کرنا ہے
شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے

حالِ **ناشاد** کیا کہے کوئی
کہیں تم پر اثر نہ ہو جائے

سنہ ۱۹۴۰ء

(۴)

پھر ہوا سودا دلِ ناشاد کیا؟
آگیا بھولا ہُوا پھر یاد کیا
ہم قفس کچھ سعیٔ آزادی بھی کر
ہر گھڑی یہ شکوۂ صیّاد کیا
بھا گئیں کیوں دہر کی رنگینیاں
ہو گیا ذوقِ نظر برباد کیا
عکسِ رنگیں ہے نگاہِ شوق کا
اور شرحِ عالمِ ایجاد کیا
ذرّے ذرّے کا جگر ہے چاک چاک
اور ہو گی عشق کی روداد کیا
زندگی ہے وقفِ سعیٔ رائیگاں
اور مجھ ناشادؔ کی روداد کیا

سنہ ۱۹۴۰ء

(۵)

کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے — یہی دنیا میں روز ہوتا ہے
دل کی بازی سبھی لگاتے ہیں — کوئی پاتا ہے کوئی کھوتا ہے
دل سے مجبور ہوں کہ مرتا ہوں — جان کر کوئی جان کھوتا ہے
آپ کی یاد آ ہی جاتی ہے — دل میں رہ رہ کے درد ہوتا ہے

گلہ و شکوہ کیا کریں ناشاد
جاں نثاروں پہ جور ہوتا ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

زہے بد گمانی، خوشا بد گمانی
محبت کو بھی تم نے ارمان جانا
کرشمے ہزاروں، ادائیں ہزاروں
کوئی سہل ہے تم کو پہچان جانا
محبت کو ہم نے محبت ہی سمجھا
نہ دشوار جانا نہ آسان جانا

(۶)

سُن رہا ہوں نغمہ ہائے سرمدی
رقصِ پیہم کر رہی ہے زندگی
ہم تو جلوؤں ہی میں کھو کر رہ گئے
سجدہ کیسا اور کیسی بندگی
عِشق کی تفسیر کیا، تشریح کیا
کیفِ روحانی، سرورِ سرمدی
کٹ ہی جائے گی کِسی کی یاد میں
زندگی کیا چار دن کی زندگی
کیا بتائیں ہجر کی شب کیا ہوا
کیا بتائیں جان پر کیا کیا بنی
ہو بُرا ناشاد عقل و ہوش کا
کر دیا برباد لطفِ زندگی

۱۹۵۱ء

(۷)

پاس ہوتے ہوئے جدائی ہے
کیا یہی شرطِ آشنائی ہے!

دل میں اک موجِ رنگ و بو اٹھی
آج یہ کس کی یاد آئی ہے

جی میں جو آئے تم وہی کرنا
بات سننے میں کیا برائی ہے

[illegible] ڈالے ہیں ماہ و انجم کے
خود نمائی سہی خود نمائی ہے

رنگ و بو سے سراغ ملتا ہے
رہ نمائی سہی رہنمائی ہے

شوق جینے کا ہے کسے تاؔشاد
زندگی یونہی کھینچ لائی ہے

سنہ ۱۹۴۱ء

(۸)

رہ گیا ہے یاد یوں عہدِ شباب   جیسے اک بھولا ہوا رنگین خواب
اس طرح اٹھی نگاہِ شوق ادھر   آگیا ان کے حجابوں کو حجاب
دل میں پھر سجنے لگی بزمِ نشاط   یاد پھر آنے لگے ماضی کے خواب
اس طرح دیکھا نگاہِ مست نے   ہر طرف اٹھنے لگی موجِ شراب
روح فرسا ہے جمودِ زندگی
انقلاب و انقلاب و انقلاب

سنہ ۱۹۴۱ء

لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ نہ جانا
دنیا کی دوستی کا ناشاد کیا ٹھکانا
دھندلے ہیں ماہ و انجم خاموش ہیں فضائیں
ان بجلیوں کے صدقے ہاں پھر تو مسکرانا
اب اپنی زندگی میں لطف آچلا ہے ہم کو
صدقے ترے ستم کے یونہی آزمائے جانا

(۹)

کوئی کیوں بے وفا ہے کیا کہیئے
اپنی اپنی ادا ہے کیا کہیئے

آپ کی کیا خطا ہے کیا کہیئے
دل ستم آشنا ہے کیا کہیئے

حُسن ہنگامہ زا ہے کیا کہیئے
عشق بے دست و پا ہے کیا کہیئے

شوق ہنگامہ زا ہے کیا کہیئے
ہر نفس مدعا ہے کیا کہیئے

چارہ سازِ دل کا کچھ قصور نہیں
درد ہی لا دوا ہے کیا کہیئے

قیدِ ہستی سے چھوٹ تو جاتے
ہر ستم آسرا ہے کیا کہیئے

حالِ ناشاد دیکھتے کیا ہو
یہ بھی شانِ خدا ہے کیا کہیئے

(۱۰)

ہر ہر نفس پیامِ محبت ہے ہمنشیں
یہ زندگی نہیں ہے عبادت ہے ہمنشیں

دل کو کچھ ان سے اور ہی نسبت ہے ہمنشیں
کیونکر کہوں کہ ربطِ محبت ہے ہمنشیں

دردِ جگر کسی کی عنایت ہے ہمنشیں
ہستی بھی ایک بارِ امانت ہے ہمنشیں

جس پر نثار دیر و حرم کی بلندیاں
افتادگیٔ عشق وہ رفعت ہے ہمنشیں

ہر ذرہ کائنات کا مستِ سرود ہے
عالم تمام نغمۂ الفت ہے ہمنشیں

سنہ ۱۹۴۱ء

حیات و موت سے مجھ کو بچا لیا تو نے
ہزار شکر کہ اپنا بنا لیا تو نے
بُرا ہو بیخودیٔ عشق کا خبر نہ ہوئی
ہزار بار گلے سے لگا لیا تو نے

(۱۱)

نظر آتے ہیں وہ کچھ مہرباں سے
گِلہ کس کو ہے اب عمرِ رواں سے

سکون و ضبط میں لاؤں کہاں سے
تمہیں پردہ اٹھا دو درمیاں سے

یہ دل میں کون چھپتا جا رہا ہے
ستارے جھانکتے ہیں آسماں سے

ازل سے آزماتے آ رہے ہو
نظر آتے ہو پھر بھی بدگماں سے

دلِ ناشاد کا قصّہ نہ چھیڑو
نکل جائے نہ کچھ اس کی زباں سے

۱۹۴۱ء

دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو
غم کے ماروں کی زندگی کیا ہے

(۱۲)

بدگمانی کو بھی خدا سمجھے
کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے

عشق کا حُسنِ ظن! معاذ اللہ!
غم کو بھی ہم تری عطا سمجھے

بدگمانی سہی بدگمانی ہے
تم محبت کو مدعا سمجھے

پوچھتے کیا ہو مدعا اس کا
جو تمھیں اپنا مدعا سمجھے

اس میں ناشادؔ کی خطا کیا ہے
التجاؤں کو تم گلہ سمجھے

۱۹۴۳ء

(۱۳)

وہ چاند سی صورت نام خدا وہ اُٹھتی جوانی! کیا کہیے
دِل لے گئے باتوں باتوں میں یہ سحر بیانی! کیا کہیے

کچھ ہنس کے کٹی، کچھ رو کے کٹی، کچھ ایسے کٹی، کچھ ویسے کٹی
رودادِ محبت کیا کہیے، رودادِ جوانی کیا کہیے

اُٹھ اُٹھ کے گِرے، گِر گِر کے اُٹھے، قسمت نے لئے لاکھوں پلٹے
سُکھ چین نہیں تھا حِصّے میں اب رام کہانی کیا کہیے

کیا پوچھتے ہو کیا تم سے کہیں اک بھُولا سا افسانہ ہے
کچھ یاد نہیں سب بھُول گئے، رودادِ جوانی کیا کہیے

اب دِل ہے کہ بیٹھا جاتا ہے، آنسو ہیں کہ اُمڈے آتے ہیں
ناشاد کے عہدِ زرّیں کی رنگین کہانی کیا کہیے

۱۹۴۳ء

(۱۴۱)

کہہ رہے ہیں وہ مدعا کہیے　　مصلحت پوچھتی ہی کیا کہیے

کیوں محبت میں کچھ بِلا کہیے　　ہے ابھی اور حوصلا کہیے

بندہ ہوں آپ ہی کا بندہ نواز　　اب بھلا کہیے یا بُرا کہیے

ہوں تو میں ہوں بُرا زمانے میں　　آپ اچھے ہیں خیر کیا کہیے

زندگی کٹ گئی خوش و ناخوش　　اس کے آگے اب اور کیا کہیے

جس سے پیدا وفا کے ہوں انداز　　اس جفا کو بھی کیا جفا کہیے

حالِ ناشادؔ پوچھتے کیا ہو
دِل بھر آتا ہے آہ کیا کہیے

۱۹۴۵ء

(۱۵)

مفت بھی دل دیا نہیں جاتا · یوں تو سودا کیا نہیں جاتا

زہر ہستی پیا نہیں جاتا · اب تو ساقی جیا نہیں جاتا

یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے · جی رہا ہوں جیا نہیں جاتا

ہائے کتنی کشش ہے دنیا میں · ترک اس کو کیا نہیں جاتا

صبر ہے ہجر کا علاج مگر · وہی ہم سے کیا نہیں جاتا

بادہ نوشی حرام ہے لیکن · بے پیے بھی جیا نہیں جاتا

جس طرح جی رہے ہو تم ناشاد
اس طرح بھی جیا نہیں جاتا

سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء

(۱۶)

مزا آ رہا ہے نئی زندگی کا کرشمہ ہوا دفنے اساںیہ عاشقی کا

زمانہ ہوا ہے نہ ہوگا کسی کا ہے دشمن یہاں آدمی آدمی کا

تمنّا ہے حور و قصور و جناں کی بہت پست ہے حوصلہ آدمی کا

کچھ اس طرح لوٹا ہے دنیا نے ہم کو کہ احساس بھی اب نہیں ہے کمی کا

جو چاہیں کریں آپ مختار ٹھہرے یہاں ہو آپ کا دل بھی ہے آپ ہی کا

ہے ناشاد کو ایک تیرا بھروسہ

نہیں ڈھونڈتا وہ سہارا کسی کا

سنہ ۴۶-۴۵-۱۹ء

سب نے چھوڑا کیا کنارا غم بھی کب تک دے گا سہارا

(۱۷)

خود تماشہ ہے خود تماشائی حسن اپنا ہے آپ شیدائی

شوق نے پھر لگائی دل میں آگ مژدہ اے زندگی بہار آئی

ہم کہاں اور کہاں تری محفل ہے محبت کی کارفرمائی

اِک تمنّا تھی ان سے مِلنے کی عمر گزری مگر نہ بر آئی

عشق کی عظمتوں سے ناواقف کر رہے ہیں ابھی جبیں سائی

اب کہاں جائیں، کون پوچھے گا تیرے دیوانے تیرے سودائی

ایک ناشادؔ کیا کہ عالم ہے
تیرا دیوانہ تیرا سودائی

سنہ ۱۹۴۶ء

(۱۸)

ہو حسن بھی خوشہ چیں اسی کا
رتبہ ہے بلند عاشقی کا

دل نذرِ جمالِ یار کرکے
احساس ہُوا ہے زندگی کا

سب موت جسے سمجھ رہے ہیں
صدقہ ہے بہارِ زندگی کا

دم توڑ رہی ہیں سب اُمیدیں
منھ دیکھ رہا ہوں بیکسی کا

ناشاؔد کا حال پوچھتے ہو
ممنونِ کرم ہے دل دہی کا

نہ ہم سے ہنستے بنتا ہے نہ روتے
یہ کوئی زندگی ہے زندگی میں

(۱۹)

رنگ لائی تری محبت کیا　　ہو گئی اہلِ غم کی حالت کیا

اب تمہیں کہہ دو ہے محبت کیا　　میں تو کہتا ہوں روگ ہے دل کا

آپ کے نقشِ پا سی نسبت کیا　　یوں تو دیر و حرم بھی ہیں لیکن

ہم نشیں اور ہے عبادت کیا　　ہر نفس ان کی یاد ہے دل میں

اُس نے بندہ بنا لیا اپنا
ورنہ ناشاد کی حقیقت کیا

جانے کیا آج ہونے والا ہے
دل دھڑکتا ہے کیوں خدا جانے

(۲۰)

نذرِ اندوہ و غمِ حیات ہوئی
کون سی ہم سے ایسی بات ہوئی

جس پہ لاکھوں مسرتیں صدقے
ایک ایسی بھی غم کی رات ہوئی

کاٹتا ہو جو عمر رو رو کے
اُس کو کیا دِن ہوا کہ رات ہوئی

ساری دُنیا سے منہ جو موڑ لیا
زیست کی کیا اجل سے بات ہوئی

چاند تارے بھی اب تو سونے لگے
اے غمِ ہجر! کتنی رات ہوئی

وقت ہے امتحان کا ناشادؔ
زندگی وقفِ مشکلات ہوئی

(۲۱)

حُسن حُسنِ صفات کیا جانے — عاشقی کے نکات کیا جانے

ہو گیا جو کسی کا سودائی — وہ حیات و ممات کیا جانے

دِل کا ایمان اور ہی کچھ ہے — عاشقی ذات پات کیا جانے

بادۂ دِل فروز سے توبہ — شیخ رازِ حیات کیا جانے

ہاں لگا دی ہے جان کی بازی
عشق ناشاؔد مات کیا جانے

ترے در سے اُٹھ تو جاؤں تو ہی منصفی سے کہہ دے
ہے مری جبیں کے قابل کوئی اور آستانہ

(۲۲)

ہر نفس اپنا اذیت کوش ہے — زندگی کیا ہو وبالِ دوش ہے

کائناتِ دل ہے اور سوزِ فراق — زندگی اک محشرِ خاموش ہے

بحرِ الفت کا کہیں ساحل نہیں — عاشقی بیگانۂ آغوش ہے

کس نے چھیڑا نغمۂ حسنِ وفا — جس کو دیکھو وہ ہمہ تن گوش ہے

تم بھی آکر یہ تماشہ دیکھ لو

موت سے **ناشاد** ہم آغوش ہے

۱۹۴۸ء

ایک دل کی کلی نہ کھل پائی — پھول لاکھوں کھلے بہار آئی

(۲۴)

مِل گیا اُس بے نشاں کا اب نشاں
کُھل گئے جو کچھ تھے اسرارِ نہاں
خانۂ دِل میں مِلا اُس کا نشاں
ڈھونڈھ آئے جا کے ہم کون و مکاں
شیخ کب تک شرع کی پابندیاں
زندگی ہے بیعتِ پیرِ مغاں
آپ میں مجھ میں نہیں ہے کوئی فرق
ایک پردہ ہے دوئی کا درمیاں
بیخود و ہشیار جو چاہیں کریں
چشمِ ساقیؔ کے اشاراتِ نہاں
کون ہے ناشادؔ کا تیرے سوا
تیری چوکھٹ چھوڑ کر جائے کہاں

۱۹۴۸ء

(۲۴)

جب تصوّر میں اُن کو لاتا ہوں دونوں عالم کو بھول جاتا ہوں

"اُف رے مجبوریاں محبت کی"[1] چوٹ کھاتا ہوں مسکراتا ہوں

جانتا ہوں مآلِ عشق مگر جان کر بھی فریب کھاتا ہوں

سچ بتا میرے بھولنے والے کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں

تیری جادو بیانیوں کی قسم تیری باتوں میں آ ہی جاتا ہوں

خارِ دامن پکڑ ہی لیتے ہیں

لاکھ ناشادؔ میں بچاتا ہوں

سنہ ۱۹۴۸ء

---

[1] حضرت عزیز لکھنوی کا مصرعہ ہے۔

(۲۵)

اپنی سی عقل و ہوش نے کوشش ہزار کی
گتھی سُلجھ سکی نہ غمِ روزگار کی

دامن کو میرے رشکِ گلستاں بنا دیا
اللہ رے دلنوازیاں پیکانِ یار کی

وہ دِن دِکھائے گردشِ لیل و نہار نے
بادِ خزاں نے بات نہ پوچھی بہار کی

دنیا کے خیر و شر میں نہیں آدمی کو دخل
تہمت لگی ہوئی ہے مگر اختیار کی

اب دیجئے سزا کہ جزا اختیار ہے
مجبوریاں تھیں وہ کہ خطا بار بار کی

ناشاد کے سوا بھی بہت جاں نثار ہیں
کیوں یاد آئی آپ کو اس خاکسار کی

سنہ ۱۹۴۹ء

(۲۶)

نہیں وہ راہ پر نہیں آتے
آتے ہیں، ہاں، ادھر نہیں آتے

غم سے راز و نیاز کے انداز
کیا کہیں عمر بھر نہیں آتے

وقت کی خوبیاں معاذ اللہ
ہم بھی اپنے نظر نہیں آتے

چپ ہیں کچھ سوچ کر اسیرِ قفس
یاد کیا بال و پر نہیں آتے

کچھ تو بہلائیں دل اسیرِ قفس
اُڑ کے دو چار پر نہیں آتے

دیکھنے کو انھیں ترستے ہیں
خواب میں بھی نظر نہیں آتے

تم ہی محرومِ دید ہو **ناشاؔد**
ورنہ کیا وہ نظر نہیں آتے

سنہ ۱۹۴۹ء

(۲۷)

جب بات بات پر وہ رہ رہ کے یاد آئیں
ناصح تو ہی بتا دے کیونکر انھیں بھلائیں

دِل جل بجھا کبھی کا اب کیا نشاں بتائیں
اک راکھ رہ گئی تھی، وہ لے اُڑیں ہوائیں

دنیا پہ خاک ڈالیں، غم کا علاج کرلیں
موسم بہار پر ہے آؤ پئیں پلائیں

اُمید منقطع ہو، دل کو تو صبر آئے
وہ صاف صاف کہدیں، ہم آئے ہیں نہ آئیں،

اک عمر کٹ گئی ہے، کچھ دن رہے ہیں باقی
یہ بھی گزار دیں گے ، وہ آئیں یا نہ آئیں

ہاں چھوڑ دیں وہ اُلفت ، لیکن یہ ہو سکیگا؟
وہ ہم کو بھول جائیں، ہم یاد بھی نہ آئیں

اب کیا کریں ہم اس کو، جب دل کہا نہ مانے
ورنہ یقین مانو ، ہوتیں نہ یہ خطائیں

ناشاد کیا کہا یہ ، کس نے کہا یہ تم سے
وہ یاد کر رہے ہیں، کیا خوب ، مان جائیں

۱۹۴۹ء

(۲۸)

غمِ دل کا علاج کیا کرتے
زخم ہوتا تو سی لیا کرتے

کب تلک ہم یونہی جیا کرتے
مر نہ جاتے تو اور کیا کرتے

ہو گئے ہیں ہم اپنے شیدائی
دل کو کیا محوِ ماسوا کرتے

بندۂ عشق ہر طرح تھے شاد
تم جفا کرتے یا وفا کرتے

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
عشق کی پھر سے ابتدا کرتے

یہی کیا کم ہے تم نے پوچھ لیا
اور اس سے زیادہ کیا کرتے

لا کے مسجد میں پی گئے ناشادؔ
اور کیا رندِ پارسا کرتے

۱۹۴۹ء

(۲۹)

پریم کہانی کون سُنائے
درد کی دولت کون لٹائے

کون لگائے دِل پھر ان سے
اُجڑی بستی کون بسائے

کہنے کو ساتھی تھے لاکھوں
وقت پڑا جب، کام نہ آئے

اپنی خیر جو چاہے کوئی
کچھ بھی کر لے، دل نہ لگائے

ان کو دیکھے مدّت گزری
ہے کوئی ایسا، ان سے ملائے

بھُول گئے تم اپنا وعدہ
کون تمہیں اب یاد دلائے

آپ کی باتیں سچ پر کوئی
اوس سے کیونکر پیاس بجھائے

کس کی یاد نے چٹکی لے لی
آنکھ میں آنسو کیوں بھر آئے

وہ نہ ہوئے ناشاؔد ہمارے
اپنے بھی سب ہوئے پرائے

سنہ ۱۹۴۹ء

(۳۰)

اب کہاں پینے پلانے کا مزا　　رنگ میخانے کا ہے بدلا ہوا

کیا کروگے لیکے تم کس کام کا　　دل ہمارا اور پھر ٹوٹا ہوا

اک پیالہ بادۂ سرجوش کا　　چل رہی ہے ساقیا ٹھنڈی ہوا

موجزن ہے اس طرح دل میں امید　　جیسے پھولوں سے گزرتی ہو صبا

اب کہیں رنگِ محبت ہی نہیں　　کیسی بدلی ہے زمانے کی ہوا

آرہا ہے اس طرح ان کا خیال　　جیسے اک جھونکا نسیمِ صبح کا

کیوں ہے آخر جور ہی ناشاد پر
آپ کے لطف و کرم کو کیا ہوا

سنہ ۱۹۴۹ء

(۳۱)

چمن کی سیر کرنے کون آیا
کھِل اُٹھے پھول سبزہ لہلہایا

نہ پوچھو اب یہ کیسا کِس کو پایا
زمانے بھر کو ہم نے آزمایا

محبت نے سبق ایسا پڑھایا
برابر ہے ہمیں اپنا پرایا

فرشتے گوش بر آواز ہیں آج
مرے لب پر یہ کِس کا نام آیا

بُھلائے اس کو مدّت ہو گئی ہے
مگر ہر بات پر وہ یاد آیا

محبّت میں نہ ہم ہارے نہ جیتے
نہ اس بازی میں کچھ کھویا نہ پایا

جدا ہے سب سے آئینِ محبت
محبت میں اگر پایا نہ پایا

نہ جانے کھو گئے وحشت میں ہم کیا
مکان و لامکاں کو وجد آیا

کٹی ہے عمر ساری کھوج کرتے
پتہ پایا نہ تیرا بھید پایا

۱۹۴۹ء

(۳۲)

بیل محبت کی جب بوئی — پھول ہنسے اور شبنم روئی

کوئی دُکھ کا مارا رویا — دنیا چادر تان کے سوئی

لطف و کرم کی تاب کسے ہے — رہنے بھی دو اب دلجوئی

تیری تمنّا کر کے پیارے — دل میں غم کی پھانس چبھوئی

سُن لو ہم نے جو کچھ پایا — منہ پر لا کر بات بھی کھوئی

کس کو راس آیا ہے پیارے — کیا لے نام محبت کوئی

دہر سے دل ناشاؔد لگا کے
اپنے ہاتھوں عزّت کھوئی

۱۹۴۹ء

(۳۳)

جھوٹی دنیا، جھوٹی مایا
کون ہے اپنا کون پرایا
عمر گنوائی، تھاہ نہ پائی
عشق میں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا

پریم نگر کی ریت نئی ہے
جس نے کھویا اس نے پایا
ان کی خوشی ہے یاد نہ آئیں
ہم نے کب انکو دل سے بھلایا
ٹوٹے دل کو جوڑ نہ پائے
اِس کو دکھایا، اُس کو دکھایا
دے ہی دیا دل ان کو آخر
بیٹھے بٹھائے روگ لگایا
غم کے مارے ایسے سوئے
جاگ نہ پائے، لاکھ جگایا
کون کسی کا تیرے سوا تھا
تو نے بڑا پیار لگایا

جان گئے ہم ناشاد آخر
جھوٹے جگ کی جھوٹی مایا

سنہ ۱۹۴۹ء

(۳۴)

اربابِ وفا کو دیکھتے ہیں　　دنیا کی ہوا کو دیکھتے ہیں

عالم کو ہوا بتا رہی ہے　　دنیا کی ہوا کو دیکھتے ہیں

کیا اپنا بنائیں آشیاں ہم　　گلشن کی ہوا کو دیکھتے ہیں

شاید کہ پیام کوئی لائے　　ہر موجِ صبا کو دیکھتے ہیں

مر مر کے جو شاد جی رہا ہو　　اُس مردِ خدا کو دیکھتے ہیں

تم دیکھ رہے ہو حُسنِ صورت　　ہم حُسنِ وفا کو دیکھتے ہیں

تم دیکھتے ہو گناہ **ناشاؔد**

ہم لطف و عطا کو دیکھتے ہیں

۱۹۶۹ء

(۳۵)

عمر کی کیا نظر نہیں ہوتی
ہوتی ہے ہاں ادھر نہیں ہوتی

دل کو غم سے مفر نہیں ہوتا
یہ وہ بازی ہی ہر نہیں ہوتی

غم کے سبب ازدواں نہیں ہوتے
مہر ہر ایک پر نہیں ہوتی

عشق میں وہ بھی وقت آتا ہے
فکر شام و سحر نہیں ہوتی

سجدے کرتے ہیں رات دن لیکن
بندگی عمر بھر نہیں ہوتی

چاہتا ہوں کہ سن سکے کوئی
شرح غم مختصر نہیں ہوتی

زندگی تلخ ہو گئی ناشاد
پھر بھی ان کی نظر نہیں ہوتی

۱۹۴۹ء

(۳۶)

ایسا بھی زندگی میں آیا ہے اک زمانہ
ناشاد سے انھیں تھا جب عشق والہانہ

دنیائے عاشقی میں وہ پھول کھل چکے ہیں
مہکا ہوا ہے جن کی نکہت سے ہر زمانہ

دنیا کی سرزمیں پر وہ ظلم ہو رہا ہے
کہتا ہے ذرّہ ذرّہ اک دکھ بھرا فسانہ

پھر کان بج رہے ہیں پھر دل دھڑک رہا ہے
پھر چھیڑتی ہے فطرت کیا سازِ عاشقانہ

سو کروٹیں زمیں لے سو انقلاب آئیں
چلتا رہے گا یونہی دنیا کا کارخانہ

سو بار کہہ چکے ہم، سو بار سن چکے تم
دہرائے جائیں کب تک دکھ درد کا فسانہ

سنہ ۱۹۴۹ء

(۳۷)

تلخیٔ زیست ہاں گوارا ہے
کس کو دم مارنے کا یارا ہے

چھوڑ دو اپنے حال پر اس کو
دلِ زار آفتوں کا مارا ہے

تم کسی کے نہیں زمانے میں
اک زمانہ مگر تمہارا ہے

ہر نفس پر ہے موت کا دھڑکا
ایسا جینا کسے گوارا ہے

ان کا زانو کبھی تھا یہ سر تھا
سر ہے اب اور سنگِ خارا ہے

دھجیاں ہو کے رہ گیا ہے اب
جامۂ زیست پارا پارا ہے

کون ناشاؔد کا ہے دنیا میں
تیرا لے دے کے اک سہارا ہے

۱۹۴۹ء

(۳۸)

پیرِ مغاں کا نام لے، ہاتھ میں اپنے جام لے
بادۂ ناب پی بھی جا، عقل سے کچھ تو کام لے

کس نے یہ دردِ دل دیا، کس نے یہ غم عطا کیا
پوچھ نہ یونہی رہنے دے، کون کسی کا نام لے

مول لگا ہے دل کا کب، لے لو تمہیں ہے گر پسند
یاد کروگے تم بھی کیا، کون اب اس کے دام لے

دیکھ کہ تیرے جاں نثار، جورِ قضا بھی سہہ گئے
اب تو ستم سے ہاتھ اٹھا، اب تو کرم سے کام لے

شکوۂ رنجِ زندگی، شیوۂ مردمی نہیں
دل کو غم آشنا بنا، صبر و سکوں سے کام لے

مجھ سے اور ان سے واسطہ، کہنے کو کوئی کچھ کہے
کون سے یہ کسی کا منھ، یونہی جو کوئی نام لے

چھوڑ بھی مے پرستیاں، رندیاں اور مستیاں
بال سپید ہو چلے، اب تو خدا کا نام لے

۱۹۴۹ء

(۳۹)

وہ کس سے کرتے ہیں بات
ان کا دن ہے ان کی رات

سب ہے دل آئے کی بات
عشق نہ جانے جات کُجات

تم سچّے، لو میں ہی جھوٹا
کون بڑھائے تم سے بات

پوچھ رہے ہیں، کون بتائے
ان سے اپنے دل کی بات

عشق کا بھی کیا کھیل ہے پیارے
جیتے بازی، پہلے مات

ہجر کی سُونی راتیں کیا تھیں؟
ہم تھے اور خدا کی ذات

ان کی بھولی بھالی صورت
ان کی پیاری پیاری بات

لاکھ بچائیں دل کو لیکن
چل جاتی ہے ان کی گھات

حال نہیں نا شاؔد کا اچھّا
اب ہے اس پر بھاری رات

۱۹۴۹ء

(۴۰)

جب نہ کچھ بھی سوا جفا ہوگا · پھر غمِ دوست جی کے کیا ہوگا

نہیں معلوم ہم کو، کیا ہوگا · جب کبھی ان کا سامنا ہوگا

جان کے ساتھ یہ بھی جائیگا · اور غم کا علاج کیا ہوگا

عشق میں جان ہی تو جائیگی · اور کیا ہوگا اور کیا ہوگا

جور کی بھی ہے انتہا کوئی · کبھی اس کا بھی فیصلہ ہوگا

دل اور اس کی یہ جلوہ سامانی · آپ ہی کا یہ نقشِ پا ہوگا

زندگی جس طرح کٹی ناشاد

آپ کا دل ہی جانتا ہوگا

۱۹۴۹ء

(۱۴)

تم کو ہماری یاد نہ آئی — ایسی ہوئی کیا ہم سے برائی
دل کی بات نہ کہنا، پیارے — منھ سے نکلی، ہوئی پرائی
کیسی دوزخ، کیسی جنّت — سب باتیں ہیں، سنی سنائی
دل بہلا لے، دھوکا کھالے — جال سے اور امیّد رہائی
وہ کیا جانے درد پرایا — جس نے دل پر چوٹ نہ کھائی
روتا ہے تیری یاد میں کوئی — سوتی ہے جب ساری خدائی
کس امیّد پہ جیتے رہیئے — کوئی تمنّا کبھی بر آئی
ہم کیا ہیں، یہ دنیا کیا ہے — کوئی سمجھ میں بات نہ آئی
کام یہی آئے گا پیارے — کر لے سب کے ساتھ بھلائی

کیوں ناشاد بنے دیوانہ؟
ان کے در تک اور رسائی

۱۹۴۹ء

(۴۲)

کون ہے راجہ کون ہے رانی
جھوٹی ہے سب پریم کہانی

کیا کہئے اب پریم کہانی
ہائے زمانہ، ہائے جوانی

حسن و جوانی، دونوں فانی
ایک فسانہ، ایک کہانی

تیری حقیقت راز ہے اب تک
کس نے اپنی ذات ہی جانی!

کیا ہے باطن؟ کیا ہے ظاہر
کون ہے باقی؟ کون ہے فانی؟

اُمرت رس' ہیں ان کی باتیں
'مدرا کا مدھ' ان کی جوانی

مدت گزری دل کو لٹائے
کیا چھیڑیں اب بات پرانی

مردہ دل میں کیوں آس آئے
کیا دیں سوکھے دھان کو پانی

جیسی گزری، اچھی گزری
کیا دہرائیں رام کہانی

دے ہی دیا ناشاد انھیں دل
تم نے کسی کی ایک نہ مانی

سنہ ۱۹۴۹ء

(۴۳)

کس نے تیرا جلوا دیکھا
کہنے کو ہاں دیکھا دیکھا

دیکھا خونِ تمنّا دیکھا
دیکھا رنگِ دنیا دیکھا

مست ہے اپنی دُھن میں دنیا
سر میں سب کے سودا دیکھا

دل میں چُبھ کر خارِ تمنّا
ہم نے خوب تماشا دیکھا

دنیا ہے آئینہ خانہ
ہم جیسے تھے ویسا دیکھا

یہ مانا ناشادؔ بُرا ہے
تم نے کوئی ایسا دیکھا

۱۹۴۹ء

کیا کہا، آپ کون ہیں، اچھا
بھول جاتا ہے یوں بھی کیا کوئی

(۴۴)

کچھ تبسم کر کے وہ کیا کہہ گئے
چاند تارے سر جھکا کر رہ گئے

تذکرہ تھا گردشِ ایام کا
آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

دیکھ کر ہوش و خرد کی کاوشیں
دل کے بندے مسکرا کر رہ گئے

بارگاہِ حسن تک پہنچا ہے کون؟
جانے والے رہگزر میں رہ گئے

دل میں ارماں تو ہزاروں تھے مگر
بن کے آنسو رفتہ رفتہ بہہ گئے

زندگی کیا ہے حجابِ روئے دوست
حضرتِ ناشاد یہ کیا کہہ گئے

۱۹۵۰ء

جان کر کون آگ سے کھیلے
جان دے کون عاشقی کر کے

(۴۵)

چپ بیٹھا کیا سوچ رہا ہے؟
اور ابھی ارمانِ وفا ہے

یہ بھی فسانہ ہم نے سُنا ہے
ان کو بھی ارمانِ وفا ہے

دل جانے کیوں ڈوب رہا ہے
جو ہونا ہے ہو گا ہو گا

دردِ دل کی کوئی دوا ہے
چارہ گر بھی اب کیا کرتے

کون بھلا ہے؟ کون بُرا ہے
خود اچھّے تو دنیا اچھی

دریا موجیں مار رہا ہے
جوشِ الم کا پوچھ نہ عالم

چپ بیٹھے کیا سوچ رہے ہو
ناشاد آگے دل میں کیا ہے

سنہ ۱۹۵۰ء

(۴۶)

یہی غم ہے تو کیا کریں گے آپ
غمِ دل کی دوا کریں گے آپ

آپ، ترکِ جفا کریں گے آپ!
کیوں کسی کا کہا کریں گے آپ!

آپ، اور ہم پہ ترکِ مشقِ جفا!
جی نہ بہلا، تو کیا کریں گے آپ

روگ لاکھوں ہیں ایک جان کے ساتھ
کس مرض کی دوا کریں گے آپ

کیا ستم شرطِ آشنائی ہے؟
اس کا خود فیصلہ کریں گے آپ

زہے قسمت، خوشا نصیب، مگر
آپ، وعدہ وفا کریں گے آپ

حالِ ناشاد کہہ تو دیں لیکن
فائدہ اس سے، کیا کریں گے آپ

۱۹۵۰ء

(۴۷)

اپنی سی ہم کر کے ہارے وہ نہ ہوئے **ناشاد** ہمارے

مر ہی گئے ہستی کے مارے کب تک جیتے غم کے سہارے

دنیا خود ننگی ہے پیارے اپنا دامن کون پسارے

عشق کی بازی کھیل کے پیارے ہارے جیتے، جیتے ہارے

عشق میں اس کا کیا غم پیارے جیتے جیتے، ہارے ہارے

کس نے عہدِ محبت باندھا چشمک زن ہیں چاند ستارے

دنیا کے اس شور اور غل میں کون سنے گا، کون پکارے

ان سے دل **ناشاد** لگا کے پھرتے ہیں اب مارے مارے

۱۹۵۰ء

(۴۸)

دل سے کب تک بات بنائیں — ان کا کیا وہ آئیں نہ آئیں

چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں — ایسے میں وہ کاش آجائیں

جینے والے جی ہی لیں گے — ان کی مرضی آئیں نہ آئیں

جتنا سُلجھے اتنا اُلجھے — پریم کی گتھی کیا سلجھائیں

ترکِ محبت کر دیں لیکن — اس پر بھی جب وہ یاد آئیں

مے سے اب تسکین نہ ہوگی — اس میں تھوڑا زہر ملائیں

ہے بھی کچھ یا کچھ بھی نہیں ہے — یوں ہی کب تک دھوکا کھائیں

ناز کرے وہ جتنا چاہے — جس کو بڑھ کر وہ اپنائیں

ناشاد ان کی آمد ہے کیا
آؤ گھی کے دیئے جلائیں

سنہ ۱۹۵۰ء

(۴۹)

آپ کی یاد عمر بھر آئی
ہم بھلایا کئے مگر آئی

دل کی ہر چوٹ پھر ابھر آئی
دیکھ کر ان کو آنکھ بھر آئی

کس نے تم کو بھلا دیا پیارے
آئی یاد اور عمر بھر آئی

جب کسی مہرباں نے پوچھا حال
دل دھڑک اٹھا آنکھ بھر آئی

لاکھ اخفائے غم کروگے مگر
کیا کروگے؟ جو آنکھ بھر آئی

کر تو لیں ہم شراب سے توبہ
پھر طبیعت جو راہ پر آئی

تابِ غم لائے کس کا تھا یہ جگر
یہ بلا عاشقوں کے سر آئی

کیوں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
ہم سفر، کس کی رہ گزر آئی

سن کے ناشاد پیار کی باتیں
یاد کیا آیا، آنکھ بھر آئی

سنہ ۱۹۵۰ء

(۵۰)

ہر طرف آگ سی لگا آئی آئی بھی تو بہار کیا آئی

جانے گلشن میں کیا گل آج کھلا ہاتھ ملتی ہوئی صبا آئی

دل کا ہر زخم ہو گیا تازہ درِ زنداں کھلا ہوا آئی

تم کو میرا خیال ہے تو ضرور!! غمِ دل کی بھی کچھ دوا آئی

بڑھ چلا اضطرابِ دلِ ناشاد

کون سے کوچے سے ہوا آئی

سنہ ۱۹۵۰ء

ہوتے رہے آپ کے اشارے

جیتے رہے زندگی کے مارے

کچھ سوچ کے رو رہا تھا کوئی

جب ڈوب رہے تھے چاند تارے

(۵۱)

کیا جینا افتاد نہیں ہے
داد نہیں، فریاد نہیں ہے

کس نے لیا دل، کس کو دیا دل
بھولے نہیں، ہاں یاد نہیں ہے

ان کا دیا سب کچھ ہے لیکن
جانے کیوں دل شاد نہیں ہے

انساں سا مجبور نہ دیکھا
قید نہیں، آزاد نہیں ہے

ہستی کیا ہے ایک گھروندا
جس کی کچھ بنیاد نہیں ہے

ان سے دل ناشادؔ لگا کے
شاد تو کیا، ناشاد نہیں ہے

سنہ ۱۹۵۰ء

(۵۲)

جب وہ ناشاد کے یہاں آئے
چاند تاروں نے پھول برسائے

ان کو بھولیں تو کس طرح بھولیں
ہم بھلا یا گئے وہ یاد آئے

اس سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے
جو نہ ہنس پائے اور نہ رو پائے

وہی بھی نازو نیاز نے فرصت
کچھ نہ کہہ پائے کچھ نہ سن پائے

وہی ہوتی ہے بات کہنے کی
لب تک آکر جو بات رہ جائے

سچ ہے یا خواب دیکھتا ہوں میں
آج یہ تم کدھر نکل آئے

ہم نے ناشاد لاکھ ضبط کیا
دیکھ کر ان کو اشک بھر آئے

سنہ ۱۹۵۰ء

(۵۳)

دنیا کی محبت مہنگی ہے، یہ مہنگا سودا کون کرے
موجوں کے تھپیڑے کون سہے، طوفاں کی تمنّا کون کرے

آغازِ محبت دیکھ لیا، انجامِ محبت دیکھ لیا
پھر عشق کو رُسوا کون کرے، تجدیدِ تمنّا کون کرے

شکوہ بھی انھیں کا کرتے ہیں، ہے لطف انھیں پہ مرتے ہیں
یہ راز ہے سرتاسر ہمدم، اس راز کو افشا کون کرے

پھر جھوم کے آئی کالی گھٹا، وہ دیکھ درِ میخانہ کھُلا
لا جام پلا، بدمست بنا، اندیشۂ فردا کون کرے

ناشادؔ ہے منزل آنکھوں میں، اٹھتے نہیں لیکن اپنے قدم
ہم خود ہی ہمت ہار گئے، تقدیر کا شکوا کون کرے

سنہ ۱۹۵۱ء

(۵۴)

زمانہ لے رہا ہے کروٹیں شاید فضا بدلے
قفس سے ہو رہائی، باغِ عالم کی ہوا بدلے

اصولِ زندگی بدلے، مذاقِ زندگی بدلا
وہ دیکھو میکدے میں شیخ بھی آئے ردا بدلے

عبادت خوفِ دوزخ سے، معاذ اللہ، کیا کہیئے
یہ طرزِ بندگی، بیچارگی، بارے خدا بدلے

نگاہِ فتنہ زا نے کیسے کیسے رنگ بدلے ہیں
کہو کیا ہو اگر یونہیں کہیں رسمِ وفا بدلے

کھری کھوٹی بہت کچھ کہہ چکا رندوں کو اے واعظ
اٹھا اب ساغرِ مے ، پی بھی جا، منھ کا مزا بدلے

پرستش ہو رہی ہے آج کل جھوٹے خداؤں کی
بساط الٹے کہیں ناشاد یہ نقشہ خدا بدلے

سنہ ۱۹۵۱ء

۵۵

تیرِ نگاہ سہہ سکے تاب ہر ایک کی نہیں

جان پہ اپنی کھیلنا ، کھیل نہیں ہنسی نہیں

محو خیالِ یار ہیں ، مست ہیں حالِ زار میں

آنکھ میں اب نمی نہیں ، ہونٹھ پر اب ہنسی نہیں

کہنے کی بات اور ہے ، کہنے کو کوئی کچھ کہے

سچ تو یہ ہے کسی سے بھی ، رسمِ وفا نبھی نہیں

رہ گئی دل کی دل میں بات ، یوں ہی گزر گئی حیات

بات کچھ ایسی تھی نہیں ، تم نے مگر سنی نہیں

دین پر اس کی شک نہ کر، ہاتھ ذرا دراز کر
دیکھ تو اس سے مانگ کر، اس کے یہاں کمی نہیں

کر کے نگاہِ التفات، جان گئے وہ دل کا راز
لاکھ بنائی ہم نے بات، بات مگر بنی نہیں

منزلِ حسن و عشق میں ایسا بھی اک مقام ہے
سجدہ جہاں روا نہیں، حاجتِ بندگی نہیں

۱۹۵۱ء

(۵۶)

ملی فرصت اگر رنج و بلا سے
کہیں گے ہم بھی کچھ اپنے خدا سے

خدا ناخواستہ تم سے گلہ ہو
شکایت ہے ہمیں اپنی دعا سے

یونہیں ربط ان سے مجھ سے ہر نفس ہو
ہو جیسے غنچہ و گل کا صبا سے

کوئی مانگے تو کیا دنیا سے مانگے
ملے کیا خاک بے برگ و نوا سے

کریں جو چاہیں بیمارِ محبّت
گیا یہ روگ اب دارو دوا سے

کبھی ناشاد کو دیکھا تو بولے
نظر آتے ہیں صورت آشنا سے

۱۹۵۱ء

(۵۷)

کہتے ہیں عشق کو سب اک روگ ہے بلا ہے
عالم پہ چھا رہا ہے یہ طرفہ ماجرا ہے

جب تو ہی ابتدا ہے جب تو ہی انتہا ہے
پھر موت و زیست کیا ہے کیا ما و ما سوا ہے

ہے زخمِ دل بھی تو ہی، زخمِ جگر بھی تو ہی
خود درد بھی ہے تو ہی خود درد کی دوا ہے

اب تو ہی خود بتا دے کیا کوئی تجھ سے مانگے
جب تو ہی آرزو ہے جب تو ہی مدعا ہے

صدقے ترے ستم کے، قربان دلدہی کے
ہنس ہنس کے پوچھتے ہو، ناشاد کیا ہوا ہے

۱۹۵۱ء

(۵۸)

تم پوچھ کے حال کیا کروگے
میرے دکھ کی دوا کروگے؟

تم اور جفا کو ترک کر دو!
بھلے گا نہ دل تو کیا کروگے

کچھ سوچ کے دل دیا تھا تم کو
معلوم نہ تھا جفا کروگے

جس طرح بھی ہے گزر رہی ہے
تم پوچھ کے حال کیا کروگے

حاضر ہے، تمہیں پسند ہے دل
ہاں یہ تو بتاؤ کیا کروگے

تم سعی کرو ہزار **ناشاد**
بگڑی قسمت کو کیا کروگے

سنہ ۱۹۵۱ء

رہنے بھی دو مداوا، چھوڑو بھی اب خدا پر
دل جل بجھا کبھی کا، ہم مر چکے کبھی کے

جور و ستم اٹھایا، لطف و کرم بھی دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی آداب زندگی کے

(۵۹)

فضا بدلے ہوا بدلے مکاں بدلے زماں بدلے
ذرا تم مسکرا تو دو کہ رنگِ آسماں بدلے

نہ پھولوں میں وہ بو باقی نہ تاروں میں ضیا باقی
نگاہِ ناز کیا بدلی زمین و آسماں بدلے

کہو تو کچھ مِلا بھی جاں نثاروں پر ستم کر کے
نہ کچھ حاصل ہو جس سے اب وہ طرزِ امتحاں بدلے

وہی ہم ہیں وہی ناکامیاں ہیں اور وہی غم ہے
نہ دورِ آسماں بدلا، نہ دورِ آسماں بدلے

خدا کیا اور بُت کیا دیر و کعبہ کیا کلیسا کیا
نظر آئے تمہیں ناشاد کو نام و نشاں بدلے

سنہ ۱۹۵۱ء

(۶۰)

دیکھ وہ آیا، دیکھ وہ آیا
یہی کہہ کہہ کے، دل کو بہلایا

ترکِ الفت بھی بس کی بات نہیں
دل کو ہر چند ہم نے سمجھایا

اے غمِ یار پوچھتا کیا ہے
کیا کہیں تجھ میں ہم نے کیا پایا

کوئی کیا کہتا، زندگی کا راز
سائنس بھی تو نہ کوئی لے پایا

یوں تو لاکھوں حسین تھے لیکن
جانے کیوں دل کو تو پسند آیا

کیا کہیں، کیا بتائیں، اب ناشاد
دل لگا کر کسی سے کیا پایا

سنہ ۱۹۵۱ء

متفرق اشعار

یکچو نکہ نہ تیری دین کے قربان جائیے
اک دل دیا ہے وہ بھی نہیں اختیار میں

دل میں ہے درد ، درد میں درمانِ زندگی
لذّت عجب ہے کشمکشِ انتظار میں

ناشاد اس نگاہ کے قربان جائیے
جو روح بن گئی مری مشتِ غبار میں

کس لئے تم کو بدگمانی ہے
دل نے کب میری بات مانی ہے

یہ کب تک پردہ ہائے ماہ و انجم
اٹھا دے ان حجابوں کو اٹھا دے

یہ کوئی دیکھنے میں دیکھنا ہے
فدا شوخی کے سب پردے اٹھا دے

ہم نفس ہم زباں نہیں کوئی
ہم وہاں ہیں جہاں نہیں کوئی

جب عیاں اپنی حقیقت ہو گئی
ذرّے ذرّے سے محبّت ہو گئی

دیکھتے ہی دیکھتے دل آگیا
باتوں باتوں میں محبّت ہو گئی

گردشِ روزگار کے ہاتھوں
کیا خزاں کیا بہار بھول گئے

شکایت کیا کریں ناشاد ہم بے التفاتی کی
جو سچ پوچھو تو دل ہی یار کے قابل نہیں نکلا

گھر کے آئی ہے غم کی کالی گھٹا
درِ مے خانہ وا ملے نہ ملے

تیری بندہ نوازیوں کے نثار
یہ نہ پوچھ اب کہ زندگی کیا ہے

عشق ہے حُسن سے جدا کوئی
اب بتائے کسی کو کیا کوئی

دِل کی قیمت، رنجِ دو عالم
کچھ تو اس کا مول بڑھاتے
کوئی سننے والا ہوتا
ہم بھی اپنا حال سناتے

محبت بے نیازِ مدعا ہے
محبت خود محبت کا صِلا ہے

یاد بھی ہیں تمھیں کہ بھول گئے
وہ محبت وہ پیار کی راتیں

کیا حال بتائیں بے دلی کا
اب تیری بھی آرزو نہیں ہے

ون سحر ہونے کو ملاقات ہوئی — ہم سے کوئی نہ مگر بات ہوئی
وکی غمِ عشق ہی نہیں اے دوست — جان کے ساتھ ہیں عذاب بہت

دیگر اصنافِ سخن

"بزمِ اربابِ جنوں"

آ سجائیں از سرِ نو بزمِ اربابِ جنوں
اک نیا صحرا نیا جوشِ جنوں پیدا کریں

آ کہ پھر مل کر اُٹھا دیں پردہ ہائے رنگ و بُو
دُور چہرے سے نقابِ شاہدِ معنیٰ کریں

چھیڑ دیں پھر سازِ دل سے نغمہ ہائے سرمدی
حسنِ فطرت لے بلائیں وہ فضا پیدا کریں

ذرّے ذرّے سے صدا نکلے کہ میں خورشید ہوں
کم سے کم اتنا تو نغموں کو تجلّی زا کریں

پھونک دیں رگ رگ میں صحرا کے فسونِ زندگی
نالۂ وحشت اثر میں وہ نوا پیدا کریں

خون کے چھینٹے بیاباں میں کریں گل کاریاں
آج خاص انداز سے آرائشِ صحرا کریں

تا بکے ناشاد جوشِ چاک داماں ئی شوق
رازِ اربابِ جنوں کو کس لئے افشا کریں

سنہ ۱۹۴۰ء

نیرنگِ جستجو

موجوں کے ترنم میں طوفاں میں تلاطم میں
بچوں کے تکلّم میں پھولوں کے تبسم میں

تو ہی نظر آیا ہے
میں نے تجھے پایا ہے

اسرارِ محبت میں جوشِ غم و وحشت میں
نزہت میں لطافت میں رنگینیٔ فطرت میں

تو ہی نظر آیا ہے
میں نے تجھے پایا ہے

نیرنگِ جستجو

ہر کاکل پیچاں میں ہر سنبل و ریحاں میں
ہر دشتِ بیاباں میں ہر صبح گلستاں میں

تو ہی نظر آیا ہے
میں نے تجھے پایا ہے

ہر عشوۂ رعنا میں ہر جلوۂ زیبا میں
ہر ساغرِ صہبا میں ہر رنگِ تمنّا میں

تو ہی نظر آیا ہے
میں نے تجھے پایا ہے

مخمور جوانی میں الفت کی کہانی میں

نیرنگِ جستجو

اندوہِ نہانی میں اشکوں کی روانی میں

تو ہی نظر آیا ہے

میں نے تجھے پایا ہے

رنگین اداؤں میں معصوم جفاؤں میں

پُرکیف فضاؤں میں خاموش صداؤں میں

تو ہی نظر آیا ہے

میں نے تجھے پایا ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

حُسنِ لاثانی

اپنا ثانی آپ ہے تو آپ ہی اپنا جواب
تیرا منھ دیکھا کریں سو ماہتاب اور آفتاب

گر ازل سے آج تک لاکھوں بنائے ماہتاب
صانعِ قدرت بنا پایا کہاں تیرا جواب

جب بنایا کچھ نہ کچھ ان میں کمی محسوس کی
اور جب تجھ سے ملایا آگئی لب پر ہنسی

اس طرح نقشے بنائے اور مٹائے بارہا
دستِ صانع پھر بنا پایا نہ تجھ سا دُوسرا

ناز ہے فطرت کو تجھ پر حُسنِ لاثانی ہے تُو
حُسن کی دیوی ہے تُو، تاشاد کی رانی ہے تُو

۶ دسمبر ۱۹۴۹

کس نے کھویا، کس نے پایا

پوچھ رہا ہوں کچھ تو بتاؤ
دِل کو کِس نے روگ لگایا

کس نے بڑھائی اِس کی قیمت
کس نے گلے کا ہار بنایا

قطرۂ خوں تھی اس کی حقیقت
کس نے اسے پروان چڑھایا

یہ سنبھلا ہے اور نہ سنبھلے
ہم نے دعا سے ہاتھ اُٹھایا

تم پہ نچھاور، تم کو مبارک
ہم نے دِل سے ہاتھ اُٹھایا

بھول نہ جانا، دل کی رانی
کس نے لُوٹا، کس نے لُٹایا

کون کہے اب کون بتائے
کس نے کھویا، کس نے پایا

سنہ ۱۹۴۹ء

—— ؞؞؞ ——

ابھی باقی ہیں طاقت کے پجاری

بدلنے کی نہیں دنیا کی صورت

دلوں میں ہے ابھی باقی کدورت

بجھی ہے آگ، چنگاری دبی ہے

مریض اچھا ہے، بیماری دبی ہے

ابھی باقی ہیں دولت کے پجاری

ابھی ہے حکمراں سرمایہ داری

ابھی ہیں خون کے پیاسے درندے

ابھی جاری ہیں خونخواری کے دھندے

ابھی "کالی" کو دنیا مانتی ہے

بظاہر گو جہاں میں "شانتی" ہے

ابھی تلوار پر ہے سب کا ایمان

کہ انساں دیتا ہے انساں کا "بلدان"

اگر ہمدم یہی حالت رہیگی

یقیں رکھ خون کی ندی بہیگی

۱۹۴۹ء

ہوا میں ہے کسی طوفاں کی آہٹ

زمانہ جلد پھر بدلے گا کروٹ
نظامِ دہر میں ہے تھرتھراہٹ

ہوا میں خون کی بُو آرہی ہے
فضائے دہر میں ہے کپکپاہٹ

خباثت کا ابھی تک شائبہ ہے
ابھی ہے ساغرِ بادہ میں تلچھٹ

ابھی سرمایہ داری کا ہے غلبہ
ابھی ہے سیم و زر کے نام کی رٹ

غریبوں کی نہیں سنتا ہے کوئی
زمانے پر ابھی حاوی ہیں نٹ کھٹ

کوئی چھوٹا، ابھی کوئی بڑا ہے
ابھی ہے بسترِ عالم میں سِلوٹ

سیاست دانِ مغرب کے تصدّق
نظر آتی ہے ان میں بوکھلاہٹ

یکایک کان پھر بجنے لگے ہیں
ہوا میں ہے کسی طوفاں کی آہٹ

بدل جائے نہ پھر دنیا کا نقشہ
نہ ہو جائے یہ کاروبار تلپٹ

سنہ ۱۹۴۹ء

.... سے خطاب

تمہاری شوخ اداؤں سے کھیل سکتا ہوں
زمانے بھر کی بلاؤں سے کھیل سکتا ہوں

وہ اور ہوں گے جو ڈرتے ہیں نارِ دوزخ سے
خطا معاف! سزاؤں سے کھیل سکتا ہوں

جفا سے باز نہ آؤ تمہیں جفا کی قسم
خدا گواہ، جفاؤں سے کھیل سکتا ہوں

جنہیں ہے وعم زمانے کی رہنمائی کا
میں ایسے رہنماؤں سے کھیل سکتا ہوں

نہ اپنی طاقت و ثروت پہ اتنا اتراؤ
میں ایسے جھوٹے خداؤں سے کھیل سکتا ہوں

زمانہ ہے جو مخالف ہوا کرے ناشاد
زمانے بھر کی بلاؤں سے کھیل سکتا ہوں

۱۹۴۹ء

ہم

ہم

نظمِ قدرت کے نکتہ داں ہیں ہم — محرمِ رازِ دو جہاں ہیں ہم

رازِ سربستہ و نہاں ہیں ہم — اپنے اور ان کے درمیاں ہیں ہم

گو بظاہر ہیں ذرۂ ناچیز — بزمِ عالم میں ضو فشاں ہیں ہم

رونقِ دو جہاں ہمیں سے ہے — زینتِ کون و لامکاں ہیں ہم

گو سمجھتے ہیں ہمارے ہی نغمے — بزمِ عالم میں نغمہ خواں ہیں ہم

ہم ہی ہم ہیں جہاں کہیں دیکھو — کیا بتائیں کہاں کہاں ہیں ہم

عشق کے ہی نہیں ہیں نبض شناس — حسن کے بھی مزاج داں ہیں ہم

شورشِ دو جہاں ہمیں سے ہے — باعثِ دورِ آسماں ہیں ہم

ہم سے لرزے میں ہے نظامِ جہاں — یوں تو اک مشتِ استخواں ہیں ہم

ان کے لطف و کرم سے سب کچھ ہے
ورنہ اک مشتِ استخواں ہیں ہم

۱۹۴۹ء

سوتے سوتے عمر گنوائی اب تو آنکھیں کھول

سورج نکلا ہوا سویرا نام ہری کا بول

مندر کے پٹ کھول لئے کیا ہوگا اس سے بول

من مندر تو بند پڑا ہے اس کے پٹ تو کھول

سارے جگ کی جھوٹی مایا جیسے چلتی پھرتی چھایا

دنیا والو بُرا نہ مانو دنیا ہے اک جھول

جھوٹے ناتے، جھوٹے رشتے، تم بھی جھوٹے، ہم بھی جھوٹے

کون ہے اپنا، کون پرایا، ڈھول کے اندر پول

کون لگائے ان کی قیمت، کون بتائے ان کے دام

پریم کے آنسو آنسو کب ہیں؟ موتی ہیں انمول

تم بھی دُکھی ہو، ہم بھی دُکھی ہیں، دُکھیا ہے سنسار

منہ سے بات جو نکلے پیارے، نکلیں میٹھے بول

ناشاد آئے ہو سوداگر نے سوچ سمجھ کر بات کرو

دل بھی پُرانا، تم بھی پرانے، اس پر اتنا مول

۱۹۴۹ء

—— : ⁘ : ——

رام گن گالے، پربھ گن گالے، گالے اُس کے گیت

تیری 'دیہہ' کا کون بھروسہ بالُو کی سی 'بھیت'

جگ کو تُو نے جیتا پھر بھی کون ہے تیرا میت

اپنے چنچل من کو پیارے جیت سکے تو جیت

کس کو اپنا کہتا ہے تو کون ہے تیرا میت

جھوٹی دنیا، جھوٹی مایا، جھوٹی جگ کی پریت

پریم نگر کی الٹی باتیں، پریم نگر کی الٹی ریت

ہار یہاں کی ہار نہیں ہے، جیت نہیں ہے جیت

گانٹھ گرہ میں دام نہیں تھے کس سے کرتا پریت
مطلب کی ہے ساری دُنیا، مطلب کے سب میت
مہنگی بھی ہے، سستی بھی ہے، دنیا کا کیا مول
جیسا گاہک ویسا مول ہے، دنیا کی یہ ریت
ناشاد آؤ تم بھی سُن لو خوب کسی نے کہہ دی بات
من کے ہارے ہار ہے پیارے من کے جیتے جیت

سنہ ۱۹۴۹ء

دنیا والو دیکھو بھالو یہ دنیا ایک جھمیلا ہے
دو ہی دن کا ہے کھیل تماشہ دو ہی دن کا میلا ہے

کہنا مانو دل نہ لگانا دِل کا لگانا کھیل نہیں

کھیل نہیں ہے دل کا لگانا کھیل یہ ہم نے کھیلا ہے

کیوں سُکھ کی اِچّھا کرتا ہے، کیوں دکھ کی چِنتا کرتا ہے

کچھ یہ بھی نہیں، کچھ وہ بھی نہیں، ہم نے یہ سب کچھ جھیلا ہے

———.:.:.:.———

قطعات

(۱)

بادۂ لالہ فام پیتا ہوں لے کے ساقی کا نام پیتا ہوں
دیکھتا کیا ہے زاہد خود بیں جو ہے تجھ پر حرام پیتا ہوں

(۲)

میں جو رہ رہ کے آہ کرتا ہوں دل کی دنیا تباہ کرتا ہوں
اب تجھے کیا بتاؤں اے زاہد جان کر کیوں گناہ کرتا ہوں

(۳)

کیوں تجھے اشتباہ ہے ساقی کس لئے عذر خواہ ہے ساقی
جس قدر ہو مجھے پلائے جا دل ابھی رو براہ ہے ساقی

(۴)

میں سب میں ہوں مگر سب سے جدا ہوں
میں خود عقدہ ہوں خود عقدہ کشا ہوں

ازل سے عقلِ انساں ہے پریشاں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہوں

(۵)

ہے چھلکنے کو ایاغِ زندگی
ٹمٹماتا ہے چراغِ زندگی
ہے اُجڑنے کو خیابانِ حیات
ہو چکی تزئینِ باغِ زندگی

(۶)

تابکے رازِ حجابِ زندگی
کچھ تو ہو تعبیرِ خوابِ زندگی
مطربِ رنگیں نوا پھر چھیڑ دے
دستِ سیمیں سے ربابِ زندگی

تمام شد